یکم و ۱۶ ستمبر ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ۔ شمارہ نمبر: ۱۷۔۱۸

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۹۲۔۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔کسی مضمون' نقطہءنظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

بی جے پی، آر ایس ایس اختلافات
مودی کے لیے نیا خطرہ!

بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی اپنا ذہنی دباؤ (اسٹریس) کم کرنے کے لیے یوگا کرتے ہیں۔ جون میں بھارت کے عام انتخابات کے نتائج کے بعد انہیں کچھ اضافی آسن کرنے پڑے ہوں گے۔اس بار پارلیمنٹ میں بی جے پی کے پاس اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اقتدار میں رہنے کے لیے اپنے اتحادیوں کے ساتھ معاہدے کرنے پڑے ہیں۔ بے روزگاری سے مایوس نوجوانوں کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے روزگار پیدا کرنے کی غرض سے جلد بازی میں اپنا بجٹ دوبارہ ترتیب دیا ہے۔اس پر مستزاد، حال ہی میں بنگلا دیش میں شیخ حسینہ کی بے دخلی سے بھارت کی خارجہ پالیسی کو بڑا دھچکا لگا ہے۔

ان کے چکرا کو غیر متوازن کرنے کے لیے یہ کافی نہیں تھا کہ ان کی پارٹی بی جے پی اور اس کی بڑی حلیف اور ہندو قوم پرستی کی علم بردار جماعت راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے درمیان غیر معمولی عوامی اختلافات بھی کھڑے ہو گئے ہیں۔

ہفتوں کی کوششوں کے بعد، ۱۱ر اگست کو دونوں فریقوں نے کیرالہ میں آر ایس ایس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۳۱ر اگست تا ۲ ستمبر) سے قبل تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے بات چیت کی تھی۔اس میٹنگ کے ایجنڈے میں متوقع طور پر عام انتخابات کے نتائج، بنگلا دیش میں ہندو اقلیت پر حملے اور بی جے پی کی لیڈر شپ کا معاملہ شامل تھا، تیسرا نکتہ شاید مودی کے لیے سب سے اہم تھا۔

اختلافات کی پہلی واضح علامت اس وقت سامنے آئی جب جے پی ناڈا جو بی جے پی کے صدر ہیں، نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ان کی پارٹی کو انتخابات میں آر ایس ایس کے تعاون کی مزید کوئی ضرورت نہیں ہے، آر ایس ایس اگلے سال اپنا صد سالہ جشن منا رہی ہے۔

اس بیان نے آر ایس ایس کے رہنماؤں کے کان کھڑے کر دیے جو خود کو ہندو قوم پرستوں کی تحریک (ہندوتوا) کے محافظوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ جماعت دعویٰ کرتی ہے کہ وہ براہ راست سیاست میں شریک نہیں ہوگی، البتہ ۷۳ ہزار مراکز جنھیں ''شاخا'' کہا جاتا ہے، کے ذریعے اپنے نظریات کی تشہیر و ترویج کرتی ہے جہاں فرقہ وارانہ سرگرمیوں، گیتوں اور مباحثوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے جن میں اکثر موضوع قوم پرستی ہوتا ہے۔۱۹۴۸ء میں آر ایس ایس کے ایک سابق رکن کے ہاتھوں مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد کچھ عرصے کے لیے پابندی کے بعد اس نے خود سے وابستہ ایک سیاسی جماعت قائم کی۔ یہ جماعت بعد میں بی جے پی بن گئی۔ یہ دونوں جماعتیں زمانے سے ایک ساتھ کام کر رہی ہیں۔ بی جے پی کے اکثر لیڈرز بہ شمول مسٹر مودی اور امیت شاہ نے آر ایس ایس کے رضا کار کے طور پر کام شروع کیا تھا۔

بلاشبہ، آر ایس ایس کے عہدیدار بی جے پی کے سینئر عہدوں پر فائز ہیں اور مسٹر مودی کی قیادت میں اس گروپ سے وابستہ لوگوں نے تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بعد میں چونکہ ہندوتوا تحریک کا جھکاؤ مسٹر مودی اور مسٹر شاہ کی طرف ہو گیا تو انھوں نے تجاویز اور تنقید کو بارِ گراں سمجھنا شروع کر دیا۔

موجودہ انتخابی نتائج نے ۷۳ سالہ آر ایس ایس چیف موہن بھگوت کو منہ کھولنے کا موقع دیا۔ چھ دن بعد اپنی جماعت کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک سچا عوامی خادم کبھی جہالت پر نہیں اترتا۔انھوں نے منی پور کی شمال مشرقی ریاست میں امن کے لیے فوری اقدامات کرنے کا کہا جہاں مودی کی حکومت مہینوں سے جاری مہلک فسادات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگلے ہفتے آر ایس ایس کے مزید دو سینئر ارکان نے اسے ہوا دی۔ جماعت کے میگزین میں لکھنے والے ایک تجربہ کار فرد رتن شاردا نے بی جے پی کی انتخابی حکمت عملی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے الزام عائد کیا کہ گلیوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس پر توجہ نہیں دی جارہی۔ پھر، آر ایس ایس کے سینئر عہدے دار اندریش کمار نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ بھگوان رام نے بی جے پی کو اس کے غرور کی سزا دیتے ہوئے اسے پارلیمنٹ کی ۲۴۰ نشستوں تک محدود کر دیا۔

بی جے پی اور اس کی نظریاتی ماں کے درمیان یہ پہلا جھگڑا نہیں ہے۔اس سے پہلے ۲۰۰۰ء کے اوائل میں بھارت میں بی جے پی کے پہلے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کا کئی بار وزیروں

اندرونی صفحات پر

- چین میں ریٹائرمنٹ کی عمر میں اضافہ
- حزب اللہ سربراہ کی شہادت کے علاقائی سیاست پر اثرات
- قلم، کتاب، طلبہ، اسکول سب پر اسرائیلی بمباری
- مسیح علیہ السلام کے دشمن، فلسطینی مسیحاؤں کے بھی دشمن ٹھہرے
- لبنان میں پیجر دھماکے: مستقبل کی جنگ کی ایک جھلک
- استعمار سے آزادی اور حصولِ انصاف کی یقین دہانی
- سری لنکا کے نومنتخب صدر اور بھارت ۔۔۔
- یوکرین اور غزہ: مغربی ممالک کے تضادات

کی تعیناتی، اتحادی نظم اور خارجہ پالیسی پر آر ایس ایس کے ساتھ جھگڑا رہا۔ تاہم، یہ اب تک کی بدترین ٹوٹ پھوٹ دکھائی دیتی ہے اور اسے حل کرنا مسٹر مودی کی فوری ترجیح ہوگی۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آنے والے مہینوں میں چار ریاستوں یعنی ہریانہ، مہاراشٹرا، جھارکھنڈ اور جموں وکشمیر میں منعقد ہونے والے انتخابات کی مہم کے دوران انہیں ہندو قوم پرستوں کی مدد کی ضرورت ہوگی۔ بی جے پی کو مہاراشٹرا اور ہریانہ میں کنٹرول حاصل کرنے کے لیے سخت مقابلے کی توقع ہے۔ نئی توانائی سے بھرپور حزب اختلاف کی جانب سے بھی جموں وکشمیر میں چیلنج کا امکان ہے اور یہ ۲۰۱۹ء میں مودی کی جانب سے مسلم اکثریتی خطے کی نیم خودمختار حیثیت ختم کرنے کے بعد پہلے انتخابات ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مسٹر ناڈا جن کی مدت جون میں ختم ہو رہی ہے، کی جگہ انتخاب میں آر ایس ایس اپنا اثر دوبارہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگرچہ بنیادی طور پر پارٹی میں اقتدار اب بھی وزیراعظم کے ہاتھ میں لیکن تکنیکی طور پر بی جے پی کے صدر ہی پارٹی کے قائد ہیں۔ اس دوڑ میں سب سے آگے بی جے پی کے جنرل سیکرٹری سنیل بنسل ہیں۔ سمرتی ایرانی جو اپنی پارلیمانی نشست کھو چکی ہیں، وہ بھی پارٹی کی قیادت سنبھالنے والی پہلی خاتون لیڈر بن سکتی ہیں۔

بہرکیف، تعیناتی میں تاخیر، اتفاقِ رائے میں کمی کا اظہار ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ آر ایس ایس مودی کے اس منصوبے کو مشکل بنا سکتی ہے کہ وہ اپنے ہم مزاج جانشین کو سامنے لائیں۔ رائے عامہ یہ ہے کہ ان کی ترجیح اور پسندیدگی میں امیت شاہ سب سے آگے ہیں۔ لیکن آر ایس ایس کے قریب ترین امیدوار نتن گڈکری ہیں، جو فی الوقت روڈ منسٹر ہیں، اور ان کے تعلقات مودی سے تلخ ہیں۔ مودی جو اس وقت ۷۳ برس کے ہو چکے ہیں، اپنی پانچ سالہ مدت پوری کرنے کے متمنی ہیں۔ وہ ۲۰۲۹ء میں پھر انتخابات میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں اب بھی آر ایس ایس کا سہارا چاہیے۔ جماعت اپنے کسی وفادار کو نائب وزیراعظم مقرر کرنے کے لیے ان پر دباؤ ڈال کر انہیں کمزور کرنے کی کوشش کرسکتی ہے۔

آر ایس ایس کے رہنما ان اختلافات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ ان چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مودی کی حکومت نے جولائی میں سرکاری ملازمین کے آر ایس ایس کا ممبر ہونے پر ۵۸ سالہ پرانی پابندی ختم کر کے اس تنظیم کو ایک اہم رعایت دی۔ اس سے بیوروکریسی پر بہت زیادہ اثر پڑے گا۔ مسٹر بھگوت کی سیکورٹی بھی مودی اور امیت شاہ کے برابر کر دی گئی ہے اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ آر ایس ایس اور اس کے حلیف گورنمنٹ پالیسی میں بہت بڑا کردار ادا کرنے والے ہیں۔

مثال کے طور پر، ۲۳ جولائی کو سرکاری بجٹ پیش کرنے سے پہلے وزیرخزانہ نرمالا سیتا رامن نے آر ایس ایس کے اکنامک ونگ کے ایک لیڈر سوادیشی جارگن سے مشاورت کی۔ انہوں نے پچھلے سال کے بجٹ پر تنقید کی لیکن اس سال کے بجٹ کی تعریف کی جس میں چھوٹے کاروباروں کے لیے ان کی تجاویز کو شامل کیا گیا تھا۔ سیتا رامن نے آر ایس ایس کی دیگر ذیلی تنظیموں سے بھی مشاورت کی جن میں لیبر یونین اور کسانوں کی تنظیم بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں ہی حالیہ سرکاری پالیسیوں کے ناقد رہے ہیں۔

آر ایس ایس کے پاس بھی اس تنازعہ کو طول نہ دینے کی وجہ ہے۔ مودی سے خفا ہونے کے باوجود تنظیم انہیں فی الحال اقتدار میں دیکھنا چاہتی ہے، کیونکہ اسے خدشہ ہے کہ مزید انتخابی ناکامیاں ہندو قوم پرست تحریک کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ لیکن یہ کشیدگی دوبارہ بڑھتی ہے یا آئندہ ریاستی انتخابات میں بی جے پی ناکام رہتی ہے تو آر ایس ایس ایک بار پھر اپنی قوت بڑھا سکتی ہے۔ یوگا کی طرح، مسٹر مودی کو سیاست میں بھی اپنی ''پشت'' پر نظر رکھنی ہوگی۔ (ترجمہ: سید عرفان احمد)

"Narendra Modi faces a new threat:
his Hindu-nationalist patrons".
("The Economist. Aug 28th 2024)

فلسطین کا بڑا قیدی

دوسرا حصہ

Nicolas Pelham

اس کے بعد تو مروان برغوثی جیل میں جاتے اور نکلتے رہے۔ اسرائیلی حکام چاہتے تھے کہ وہ زیادہ گڑبڑ نہ پھیلائیں۔ اس کے لیے انہیں اردن کی سرحد کے پار بھیجا جاتا رہا۔ فدوہ بچے سمیت اردن کے دارالحکومت عمان میں اُن سے جا ملی۔ مروان نے بیوی کو خبردار کیا کہ اگر اسرائیلی فوجی یا پولیس والے پیچھا نہیں کر رہے تو وہ زیادہ خوش گمان نہ ہو اور نارمل زندگی بسر کرنے کا نہ سوچے۔ انہوں نے کہا جب فلسطین آزاد ریاست میں تبدیل ہوگا تب میں ایک فیملی مین کے طور پر واپس ہو سکوں گا۔

اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد وہ عظیم مزاحمتی تحریک شروع ہوئی جسے انتفاضہ کہا گیا۔ اس کی ابتدا پتھراؤ سے ہوئی تھی اور پھر فائرنگ کے واقعات بھی ہونے لگے۔ تب تک مروان فتح کی جلاوطن قیادت میں اہم شخصیت کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ وہ دنیا بھر میں گھوم پھر کر فنڈز جمع کرتے تھے۔ اس دوران اُن کی فیملی کا حجم بھی بڑھتا گیا۔ ان کے چار بچے ہوئے۔ فدوہ بتاتی ہے کہ عمان میں گزاری جانے والی زندگی بہت پُرسکون اور بہت بیزار کن تھی۔

۱۹۹۳ء میں پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات نے اسرائیل کے اس وقت کے وزیراعظم یزاک رابن سے ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں امن معاہدہ کیا۔ اس کے نتیجے میں مروان جیسے لوگوں کو وطن واپسی کا موقع ملا۔ بہت سوں نے آبائی یعنی مقبوضہ فلسطینی علاقوں سے باہر عشرے گزارے تھے۔ وہ اپنے لوگوں سے بے تعلق سے رہے تھے۔ لوگ انہیں نئے تارکینِ وطن کہا کرتے تھے۔ مروان صرف پانچ سال فلسطین سے دور رہے تھے۔ انہوں نے مقبوضہ فلسطین کے لوگوں اور اُن کے مستقبل کے قائدین کے درمیان پُل کا کردار ادا کیا۔

فتح کو پہلی بار غرب اردن میں کام کرنے کا موقع ملا۔ مروان نے گرفتاری کے خوف کے بغیر ریلیاں نکالیں۔ وہ فلسطینی سیاست دانوں سے روابط پروان چڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ مغربی حکومتوں نے اوسلو معاہدے کی بھرپور حمایت کی۔ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان تعلقات کے ایک حسین دور کا آغاز ہوا۔ وہ ساتھ سفر کرنے لگے۔ اور بہت سوں کے درمیان اچھے تعلقات بھی قائم ہوئے۔

مروان برغوثی عبرانی جانتے تھے اور بولتے بھی تھے۔ ۱۹۹۶ء میں پہلی فلسطینی پارلیمنٹ کے انتخابات کے بعد وہ فلسطینی اور اسرائیلی ارکان کے اجتماعات میں شریک ہونے لگے۔ وہ معقول حسِ مزاح کے مالک تھے جس کی بدولت بہت سے اسرائیلی اُن کے دوست بن گئے۔ اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب کے ایک ریسٹورنٹ میں اجتماع کے دوران انہوں نے از راہِ تفنن کہا ہم نے جیل میں ۱۴۵ سال ساتھ گزارے ہیں۔ اس پر سابق اسرائیلی انٹیلی جنس چیف گڈیون ایزرا نے کہا اور تمہیں وہاں تک میں نے پہنچایا تھا۔

بنیامین نیتن یاہو کی لِکود پارٹی کے پارلیمانی رکن مائر شتریت کی مروان سے گاڑھی چھننے لگی۔ ایک بار اٹلی میں امن کانفرنس کے دوران شتریت بیمار پڑا تو مروان رات بھر اُس کے پاس بیٹھے رہے۔ شتریت کا کہنا ہے کہ مروان مکمل امن کے حامی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسرائیلی اور فلسطینی مل کر رہیں اور اِسی لیے اُن سے میری دوستی گہری ہوگئی۔

اسرائیل کی داخلی انٹیلی جینس ایجنسی شِن بیت کے ایک کمانڈر نے راملہ میں مروان سے ملاقات کی۔ یہ کمانڈر ابو فرح کے نام سے معروف تھا اور کئی فلسطینی سیاست دانوں سے ملاقات کر چکا تھا۔ حماس کے بانی احمد یاسین سے بھی وہ ملتا رہا تھا۔ اس نے یہودیوں کے نئے سال کی آمد پر احمد یاسین کو تہنیتی کارڈ بھی دیا تھا۔ ابو فرح کو مروان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اُس کا کہنا تھا کہ مروان واقعی امن چاہتے تھے، حقیقی امن۔ مروان کے سابق معاون سمیر سَنجلاوی کا کہنا ہے کہ اُن کے گھر کے دروازے سب کے لیے کھلے رہا کرتے تھے۔ وہ کسی بھی اسرائیلی سے ملنے سے انکار نہیں کرتے تھے۔

اوسلو معاہدے کے تحت فلسطینیوں نے اسرائیل کو ریاست تسلیم کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور اسرائیلی حکام نے صرف پی ایل او کو فلسطینیوں کی نمائندہ تنظیم کے طور پر قبول کیا۔ اسرائیل کا کہنا تھا کہ امن عمل کا اختتام فلسطینی ریاست کے قیام پر ہوگا۔ اس حوالے سے کوئی ڈیڈ لائن نہیں دی گئی تھی۔

امن عمل کو ٹھکانے لگانے والوں نے اسرائیلی شہریوں پر خودکش بم حملے شروع کر دیے۔ گفت وشنید میں فلسطینی ریاست کے قیام کے بارے میں بات کرنے کے بجائے اسرائیلی حکام اسلامی شدت پسندوں کے خلاف کریک ڈاؤن کی بات کرتے تھے۔ ابو فرح نے مروان سے کئی ملاقاتوں کے بعد کہا کہ ہمارا مقصد اسرائیل کے خلاف مزاحمت کرنے والوں سے نپٹنا تھا۔

اس دوران غرب اردن اور غزہ میں یہودیوں کی آباد کاری جاری رہی۔ اس کے نتیجے میں مسلح یہودی بھی ان علاقوں میں دکھائی دینے لگے۔ اس کے بعد اسرائیلی فوجیوں کی تعیناتی شروع ہوئی۔ فلسطینی یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ کتنی زمین بچے گی جس پر اُن کی ریاست قائم ہوگی۔

مروان کو اندازہ ہو گیا کہ اوسلو معاہدے کو ناکام بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انہوں نے فلسطین اور اسرائیل کے دورے کر کے اعتدال پسندوں کو خبردار کیا کہ فلسطینی ریاست کے آئیڈیل کے خلاف کام ہو رہا ہے۔ تب تک مروان کو غرب اردن میں فتح کا سیکرٹری جنرل بنایا جا چکا تھا۔ یہ بہت اہم عہدہ تھا۔ اس کے بعد انہیں انتفاضہ تحریک کے دوران سرگرم رہنے والے کارکنوں کے معاملات دیکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس سلسلے میں بجٹ یاسر عرفات کے دفتر سے دیا جاتا تھا۔

یاسر عرفات پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے اسرائیل کی سلامتی اور فلسطین کی آزادی کا وعدہ کیا مگر اس پر عمل کرانا اُن کے بس میں نہ تھا۔ مروان اُن کی جگہ جلسوں میں دکھائی دینے لگے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہنے لگے کہ وہی اب یاسر عرفات کے جانشین ہیں۔ ابو فرح کا کہنا ہے کہ یاسر عرفات بھی مروان کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے۔ اُن کی نظر میں مروان مستقبل کا لیڈر تھا۔

جولائی ۲۰۰۰ء میں اس وقت کے امریکی صدر بل کلنٹن نے فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان حتمی تصفیے کے لیے ایک سربراہ ملاقات کا اہتمام کیا مگر کشیدہ ماحول میں بات بن نہ سکی اور بیت المقدس کے معاملے پر اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ فریقین کو اندازہ تھا کہ تشدد روکنا آسان نہیں۔ لِکود پارٹی کے لیڈر ایریل شیرون نے بیت المقدس میں گنبدِ صخرہ کا دورہ کر کے معاملات کو اور بگاڑ دیا۔ یہ مقام مسلمانوں اور یہودیوں کے لیے یکساں محترم ہے۔ مروان برغوثی ایریل شیرون کا ''خیر مقدم'' کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے شیرون کے سیکیورٹی اسٹاف کی طرف کرسیاں اچھال دیں۔ یہاں سے دوسری انتفاضہ شروع ہوئی۔

غرب اردن میں معاملات چشم زدن میں خراب ہوگئے۔ مروان نے عالی شان ہوٹلوں میں قیام کے پانچ سالہ دور کو خیر باد کہتے ہوئے دوبارہ راملہ کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ وہ مزاحمت کرنے والوں کی قیادت کرنے لگے۔ انہیں وہ یہودیوں کی بستی بیت ال تک لے جاتے۔ وہیں ایک اسرائیلی فوجی اڈا بھی تھا۔ فلسطینی نوجوان پتھراؤ کرتے اور جواب میں اسرائیلی فوج ربر کی گولیاں چلاتے۔ کبھی کبھی وہ اصلی گولیاں بھی داغ دیتے۔ کبھی کبھی اپاچی ہیلی کاپٹر بھی آجاتے۔ مزاحمت جاری رہی۔ جب کئی ہفتوں کے دوران ہلاکتیں بڑھ گئیں تو فلسطینیوں نے گھر کی چھت سے فائرنگ شروع کی۔ دوسری انتفاضہ کو خوں ریز ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

۲۰۰۰ء کے آخر تک مروان نے فلسطینی نوجوانوں پر مشتمل الاقصیٰ مارٹرز بریگیڈ قائم کر دی۔ ابتدا میں یہ غرب اردن کی یہودی بستیوں اور مقبوضہ علاقوں میں تعینات اسرائیلی فوجیوں پر حملوں تک محدود تھی۔ اب مروان اسرائیلی خفیہ اداروں کے راڈار پر آگئے۔ شِن بیت کے سابق کمانڈر نے بتایا کہ انہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تاہم اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ ایک بار وہ اپنی گاڑی کی طرف جا رہے تھے تب ایک گولا داغ کر اُن کے گارڈ کو شہید کیا گیا۔ یہ انتہا تھا۔ وہ ہر روز الگ مقام پر سوتے تھے۔

اسرائیلی دوست اُنہیں عسکریت پسندی سے دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں شتریت بھی شامل تھے۔ وہ تب تک وزیر انصاف بن چکے تھے۔ مروان ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کسی بھی علاقے پر قبضے کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ وہ کہتے تھے میں دہشت گرد نہیں ہوں مگر خیر، میں امن پسند بھی نہیں ہوں۔ یہ بات انہوں نے واشنگٹن پوسٹ کے لیے ایک مضمون میں بھی لکھی۔ وہ کہتے تھے میں اسرائیل کو ختم نہیں کرنا چاہتا مگر میں اپنے وطن پر قبضہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔

مروان اسرائیل کی حدود میں عام شہریوں پر حملوں کے خلاف تھے۔ فتح میں یہ تاثر ابھرنے لگا کہ حماس اور اسلامی جہاد کی طاقت بڑھ رہی ہے۔ وہ گرین لائن کے اندر جا کر خودکش حملے کر رہے تھے۔ ۲۰۰۱ء کے موسمِ گرما میں تل ابیب کے ایک نائٹ کلب پر خودکش حملہ کیا گیا جس میں ۲۱ افراد ہلاک ہوئے۔ ان میں ۱۶ نوجوان تھے۔

اوسلو معاہدے سے تعلق رکھنے والی اہم اسرائیلی شخصیت ران پنڈک نے غرب اردن کے ایک محفوظ مکان میں مروان برغوثی سے ملاقات کی اور اُن سے کہا کہ عسکریت پسندی ترک کر دیں۔ اس پر ان کا کہنا تھا کہ ہم میدان حماس اور اسلامی جہاد کے لیے خالی نہیں چھوڑ سکتے۔

۲۰۰۱ء کے آخر تک الاقصیٰ مارٹرز بریگیڈ نے اسرائیل کے اندر خودکش بمبار بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ نائن الیون تازہ تازہ ہوا تھا۔ پی ایل او کے بارے میں بھی شکوک وشبہات موجود تھے۔ اسرائیل نے امریکا کو خبردار کیا کہ القاعدہ اور پی ایل او کا خمیر ایک ہے۔ اس پر اسرائیلی ٹینکوں نے فلسطینی شہروں اور قصبوں کو روندنا شروع کیا۔ اس پر بہت سے فلسطینیوں کو عسکریت پسندی کی راہ پر چلنے پر افسوس ہوا۔ ۲۰۰۲ء کے موسمِ بہار تک خود مروان بھی یک طرفہ جنگ بندی پر غور کرنے لگے۔

۱۵ اپریل کو مروان سے ایک بڑی غلطی ہوئی۔ انہوں نے ایک ایسا سیل فون استعمال کیا جسے شِن بیت ٹریک کر رہی تھی۔ وہ فتح کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے گھر میں تھے۔ انہیں گرفتار کرنے کے آپریشن کی قیادت شِن بیت کا افسر گونین بین یزاک کر رہا تھا۔ اسرائیلیوں نے مروان کو پکڑ تو لیا مگر اُنہیں مارنے کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔ انہیں گرفتار کر کے لے جاتے وقت اسرائیلیوں نے کہا ہم نے سانپ کو سر سے پکڑ لیا ہے۔

بیت المقدس کے رُشین آرتھوڈوکس علاقے میں واقع جیل ماسکوبیا کو سو سال سے بھی زائد مدت سے تفتیشی مرکز کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ یہاں مروان کو لٹر کپن میں بھی رکھا گیا تھا۔ مروان کو جیسے ہی یہاں پہنچایا گیا اُنہوں نے شِن بیت کے

سربراہ ایوی ڈِچر سے ملنا چاہا۔ ایوی ڈِچر انہیں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اسرائیلیوں نے نچلے درجے کے افسران سے ملاقات رکھوائی۔ تفتیش شروع ہوئی جو مہینوں جاری رہی۔ مروان پر ۳۷ حملوں میں کلیدی کردار ادا کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ ان میں مارچ ۲۰۰۲ء میں تیل ابیب کی ایک سی فوڈ مارکیٹ میں فائرنگ کا واقعہ بھی شامل تھا جس میں تین سویلین مارے گئے تھے۔

مروان چونکہ قائدانہ حیثیت میں کام کرتے تھے اور عسکری وارداتوں کے براہِ راست نگراں تھے اس لیے انہیں موردِ الزام ٹھہرانا آسان بھی تھا اور حیرت انگیز بھی نہ تھا۔ ابوفرح کا کہنا تھا کہ جو بم دھماکے کیے گئے اُن کے تار تو اُنہوں نے نہیں جوڑے تھے مگر خیر، کمانڈر تو وہی تھے۔

شِن بیت افسر بین یزاک نے چارج شیٹ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الاقصیٰ مارٹرز بریگیڈ فتح کی سپریم کمیٹی کی نگرانی میں کام کرتی تھی اور مروان بھی اس کے رکن تھے مگر سچ یہ تھا کہ یہ گروپ اپنے طور پر کام کرتا تھا اور مروان نے ہمیشہ سویلینز کے قتل کی شدید مخالفت کی تھی۔ بین یزاک نے بتایا کہ مروان کا عسکری بیک گراؤنڈ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ سیاست میں فعال رہے تھے۔ اسرائیلی چاہتے تھے کہ مروان کو نشانِ عبرت بنا دیا جائے کیونکہ اُنہوں نے بھرپور میل جول رکھنے کے بعد دھوکا دیا تھا۔ ابوفرح کے بھی یہی جذبات تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ مروان ہمارا پارٹنر تھا مگر ہمارے ساتھ بیٹھنے کے باوجود اس نے یہ سب کچھ کیا۔

مروان پر سویلین کورٹ میں مقدمہ چلایا گیا۔ کوشش تھی کہ وہ ہائی پروفائل نہ رہیں اور ہیرو نہ بنیں۔ مروان نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ عدالت میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ہاتھ سر پر اس طور لے جاتے تھے جیسے فتح کا نشانہ بنا رہے ہوں۔ ایک موقع پر انہوں نے خاصی جذباتی تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ میں تو فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے لیے یکساں طور پر امن چاہتا ہوں۔ اس پر جج کو یقین ہوگیا کہ جو امن کی بات کرتا ہو وہ انسانوں کو بم میں تبدیل کرنا نہیں چاہے گا۔

دو سال تک مقدمہ چلا اور مروان کو ایک تنگ کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ ۶ جون ۲۰۰۴ء کو انہیں سزا سننے کے لیے بلایا گیا۔ ان پر سے ۲۱ مقدمات ختم کردیے گئے۔ قتل کی پانچ وارداتوں میں ان کا ملوث ہونا پایا گیا۔ انہیں پانچ بار عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ اور اضافی طور پر ۴۰ سال کی سزائے قید۔ ان کے معاون سَنجلاوی کا کہنا ہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ بیس سال قید کی سزا سنائی جاسکتی تھی اور اب تک وہ رہا بھی ہوچکے ہوتے۔ ہمیں جیل میں کوئی علامت نہیں بلکہ اپنے درمیان ایک لیڈر چاہیے۔

مروان کو الگ تھلگ رکھا جاتا رہا۔ ۲۰۰۵ء میں انہیں عام قیدیوں کے ساتھ رکھا جانے لگا۔ اب انہوں نے جیل میں پڑھانا شروع کردیا۔ صبح نو سے شام پانچ بجے تک وہ لیکچرز دیا کرتے تھے۔ وہ گارڈز سے کہا کرتے تھے تم نے ہمارے جسم جکڑے ہیں، ذہن نہیں۔ مروان نے قیدیوں میں پڑھنے لکھنے کی ایسی لگن پیدا کی کہ ۱۲۰۰ قیدیوں نے گریجویشن کی۔

مروان نے فلسطینی جمہوریت پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کیا۔ وہ چینی معیشت یا پھر کلاسیکل اسلام میں مذہبی رواداری کے حوالے سے لیکچرز دیا کرتے تھے۔ جیل کے قیدی انہیں پروفیسر کہا کرتے تھے۔

مروان نے جیل میں کتب خانہ بنایا جس میں دو ہزار کتابیں تھیں۔ انہیں تاریخ سے خاص شغف تھا۔ وہ اسرائیل کے بارے میں اور قیادت کے بارے میں بھی کتابیں بہت ذوق وشوق سے پڑھا کرتے تھے۔ یہ بات جیل میں کتب خانے کے نگراں یوال بٹن نے بتائی۔ مروان یوال نوح ہراری کی ''سیپنز'' سے بھی بہت متاثر ہوئے۔

جیل میں مروان کے لیے بہت حد تک سیلیبرٹی کا سا درجہ تھا۔ اسرائیلی سیاست دان بھی اُن سے ملنے آیا کرتے تھے۔ فلسطینی سیاست دانوں کے لیے ایسا کرنا آسان نہ تھا۔ اگر خود مروان کی بیوی بھی اُن سے ملنا چاہتی تھی تو اُسے باضابطہ درخواست دے کر اسرائیل میں داخل ہونے کا پرمٹ لینا پڑتا تھا۔ اُسے ملاقات والے دن صبح کے پانچ بجے اٹھنا پڑتا تھا اور تلاشی کے کئی اذیت ناک مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ چیک پوائنٹس اور جیل کے گیٹ پر اُس کی جامع تلاشی لی جاتی تھی۔ پھر اُسے اپنے شوہر سے شیشے کے پیچھے بیٹھ کر ۴۵ منٹ بات کرنے کی اجازت ملتی تھی اور یہ اجازت بھی حکام کوئی وجہ بتائے بغیر کسی بھی وقت منسوخ کرسکتے تھے۔ بیس سال کے دوران مروان کے اہلِ خانہ نے اُن کی بس ایک آدھ جھلک ہی دیکھی ہے۔

۲۰۰۴ء میں یاسر عرفات کا انتقال ہوگیا۔ وہ کوئی بہت موثر لیڈر نہیں تھے مگر پھر بھی انہوں نے فلسطینی کاز کو کسی حد تک زندہ رکھا اور اجاگر کیا۔ ان کے جانشین محمود عباس بہت مختلف شخصیت ہیں۔ وہ لڑائی جھگڑا نہیں جانتے تھے۔ انہیں بہت حد تک انتہائی محتاط بیوروکریٹ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ فلسطینی کابینہ کے چند سابق ارکان کا کہنا ہے کہ محمود عباس اس بات کو کسی بھی طور زیادہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اسرائیلیوں کو مشتعل کیا جائے۔

(۔۔۔جاری ہے!)

"Marwan Barghouti, the world's most important prisoner". ("The Economist". July 22, 2024)

بقیہ: مسیح کے دشمن، فلسطینی مسیحاؤں کے بھی دشمن ٹھہرے

ڈبلیو ایچ او کے مطابق جنگ کے گیارہویں مہینے کے اختتام تک غزہ کے ۳۶ ہسپتالوں میں سے ۱۶ جزوی حد تک کام کرنے کی حالت میں رہے ہیں۔ تقریباً ۲۹ لاکھ کی آبادی کے لیے کل ۱۴۹۰ بیڈ مختلف اسپتالوں میں بروئے کار ہیں لیکن ۱۶ اسپتالوں میں سے بھی سب تک مریضوں اور زخمیوں کو پہنچانا کسی کے بس میں نہیں۔ راستے میں اسرائیلی فوج، فوجی ناکے اور ملبے کے علاوہ بھی جگہ جگہ بندش نے ان جزوی کارآمد اسپتالوں تک رسائی کو بھی قریب قریب کلی طور پر ناممکن بنا دیا ہے۔ غزہ میں تمام ۱۳۲ پرائمری ہیلتھ کیئر مراکز میں سے ۵۸ کسی قدر قابل استعمال رہ گئے ہیں۔ ان میں غیر ملکی این جی اوز کے قائم کردہ پرائمری ہیلتھ کیئر مراکز بھی شامل ہیں مگر صرف ۴۴ فیصد کام کے لائق وہ بھی جزوی طور پر۔

بین الاقوامی سطح پر طبی امور میں معاونت دینے والے ادارے میڈیکل اسسٹنس پروگرام (MAP) نے مقبوضہ مغربی کنارے میں کام کرنے والوں کو اسرائیلی فوج اور یہودی آبادکاروں کے حملوں سے بچنے کے لیے بلٹ پروف جیکٹس اور ہیلمٹس دیے تھے۔ یہ جان بچانے کے آلات فلسطینی ہلال احمر کے توسط سے دیے گئے مگر غزہ جہاں باقاعدہ جنگ ہے یہاں تو بلٹ پروف اور بم پروف دونوں طرح کی سہولیات کی ضرورت ہوگی کہ یہاں اسرائیلی جنگ کا خصوصی نشانہ طبی عملہ بھی ہے۔ اس لیے طبی عملے کے ارکان نے طبی عملے کی شناخت بننے والا یونیفارم پہننا بھی چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح صحافیوں کو پریس لکھی جیکٹوں کی وجہ سے اسرائیلی فوج تاک کر گولی مارتی ہے۔ غزہ کے طبی عملے کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ لیکن سوال یہ بنتا ہے کہ MAP نے جب ڈاکٹروں کو اسرائیلی فوج اور یہودی آبادکاروں سے لاحق خطرے کو بھانپ اور سمجھ لیا تھا تو عالمی طاقتیں اور عالمی ادارے کیوں یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔

ان حالات میں الناصر اسپتال، الجیتر ین اسپتال، ترکش اسپتال، دارالسلام اسپتال، بیت حنون اسپتال، بالسم اسپتال اور بہت سے ایسے اسپتال جن پر ایک سے زیادہ مرتبہ اسرائیلی فوج بمباری یا حملے کرچکی ہے مگر امریکی ارکان کانگریس ہیں کہ انہوں نے ۲۱ جولائی کو اس کے باوجود وزیر اعظم نیتن یاہو کو ڈیسک بجا بجا کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان عالمی اتحادیوں کے خلاف 'ڈاکٹرز ودآؤٹ بارڈرز' نامی تنظیم بھی بے بس ہے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی کے بعد

چین میں ریٹائرمنٹ کی عمر میں اضافہ

چینی لیڈر شی جن پنگ کو اس بات پر ناز ہے کہ ان کا سیاسی نظام مشکل کام کرنے کی بے مثال صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا تھا، ''پارٹی اور عوام کے لیے جو کچھ مفید ہو سکتا ہے، ہمیں اس پر جرأت کے ساتھ عمل پیرا ہونا اور فیصلہ کرنا چاہیے''۔

۱۳ ستمبر تک کئی سال کی عدم فیصلہ سازی کے بعد، چین نے ۱۹۵۰ کی دہائی کے بعد ریٹائرمنٹ کی عمر میں پہلی بار اضافہ کیا ہے۔ اس طرح، چین ریٹائرمنٹ کی عمر کے حوالے سے دنیا کے سب سے نچلے درجے کے ممالک میں سے امیر دنیا کے معیارات کے قریب تر ہونا شروع ہو جائے گا۔ دیگر ممالک میں اس قسم کی تبدیلیوں پر ناپسندیدہ ردِعمل دیکھتے ہوئے مسٹر شی کے پاس اس فیصلے کے حوالے سے ہچکچاہٹ کی وجہ تھی۔

مغرب میں پائی جانے والی افراتفری ایک ایسا نکتہ ہے جس سے چین کے پروپیگنڈا گر فائدہ اٹھاتے ہیں تاہم گزشتہ برس فرانس میں پنشن کی عمر میں اضافے کے خلاف بڑے پیمانے پر ہونے والے مظاہروں کے بعد چین میں حکومت کی جانب سے ایسے کسی بھی فیصلے پر تشویش اور غصے کا اظہار کیا گیا تھا۔

جب چین نے یہ سخت اقدام کیا اور اس کے حوالے سے اپنا ٹائم ٹیبل شائع کیا تو اسے بہت کم نمایاں کیا گیا۔ سرکاری ٹیلی ویژن نے اس دن کی مرکزی خبروں میں اس اقدام کو کئی خبروں کے بعد بیان کیا۔ بلیو کالر خواتین کارکنوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر حیران کن طور پر ۵۰ سے ۵۵ سال تک بڑھا دی گئی؛ وائٹ کالر خواتین کارکنوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر ۵۵ سے ۵۸ سال کر دی گئی؛ اور مردوں کی عمر ۶۰ سال سے ۶۳ سال کر دی گئی ہے۔

ان تبدیلیوں کا اطلاق جنوری ۲۰۲۵ء سے ہوگا اور اگلے ۱۵ سال میں مرحلہ وار نافذ العمل ہوں گی۔ وائٹ کالر خواتین اور مرد کارکنوں کے لیے پنشن کی عمر ہر دو مہینے بعد ایک مہینہ بڑھ جائے گی۔ ان خبروں میں اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی لیکن انٹرنیٹ صارفین کو حکومت کے اس اقدام سے بہت مایوسی ہوئی ہے۔ چین کی مائیکرو بلاگنگ ایپ پر ''ریٹائرمنٹ کی قانونی عمر کو مؤخر کرنے کے لیے اصلاحات'' کے ہیش ٹیگ کے ساتھ پوسٹوں کو ۸۷ کروڑ سے زیادہ بار دیکھا گیا اور ۲ لاکھ ۴۰ ہزار سے زیادہ تبصرے کیے گئے ہیں۔

تاہم اس پر تیزی سے سنسر لگایا گیا ہے، شنہوا کی ابتدائی رپورٹ کے نیچے ۵۱۰۰ سے زائد کمنٹس پوسٹ کیے گئے تھے، اب وہاں تیس سے کم کمنٹس بچے ہیں جن میں سے کوئی بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن عوامی غصے کا پتا ان اکاؤنٹس کے کمنٹس سے چلتا ہے جنھیں زیادہ فلٹر نہیں کیا گیا۔

ایک تھریڈ میں لکھا گیا، ''سرمایہ دارانہ استحصال عوام تک پہنچ چکا ہے۔ زبردست!'' کسی اور نے ملک کی ربر اسٹیمپ مقننہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہ جس نے عوامی مشاورت کے بغیر اچانک اصلاحات کی منظوری دے دی، سوال کیا، ''پیپلز کانگریس کس کی نمائندگی کر رہی تھی؟'' ایک اور نے بھڑاس نکالی، ''کرپٹ افسران ہی طویل عرصے تک کام کرنا پسند کرتے ہیں۔'' کسی اور نے کہا، ''اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو معاشرہ افراتفری کا شکار ہو جائے گا''۔

تاہم اس بات کا امکان کم ہی ہے۔ نگرانی بہت سخت ہے اور مظاہروں کی صورت میں پولیس بدامنی کو کچلنے کے لیے بہت مستعد ہے۔ انھیں یقین ہے کہ یہ ردِعمل بہت معمولی ہے اور اس سے سیاسی مقامات پر دراندازی بعید ہے۔ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ جیسے ۲۰۱۸ء میں پنشن کی عمر میں اصلاحات کے خلاف روسی شہروں میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا، کیا چین ایسے کسی ردِعمل کو برداشت کر پائے گا۔ چین نے ان واقعات پر بہ شمول وہ اقدامات جو روسی حکمران ولادیمیر پیوٹن نے کیے، توجہ مبذول کر رکھی ہے۔ پیوٹن ریٹائرمنٹ کی عمر خواتین کے لیے ۵۵ سے ۶۳ کرنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے اسے ۶۰ برس تک بڑھایا، تاہم مردوں کی عمر کے لیے وہ ۶۵ سال (۶۰ سے بڑھا کر) پر قائم رہے۔

طویل عرصے سے اس بات کی توقع کی جا رہی تھی کہ جب چین ایسا کوئی اقدام کرے گا تو وہ مردوں اور عورتوں کے لیے ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۵ سال کرنے کی طرف بتدریج قدم بڑھائے گا۔ یہ OECD (سب سے زیادہ امیر ممالک کا کلب جہاں ۲۰۲۲ء میں مردوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۴ء۴ اور خواتین کے لیے ۶۳ء۶ سال ہے) کی اوسط عمر سے کچھ زیادہ ہوگا۔ بعد میں، چین نے طے کیا کہ مردوں کو ۶۳ برس کی عمر تک کام کرنے کی ضرورت ہے اور وہ چاہیں تو ۶۶ برس کی عمر تک کام کر سکتے ہیں۔ خواتین بھی اس لچک سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر چین احتجاج سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس نے ریٹارمنٹ کی عمر بڑھانے کا اقدام پہلے کیوں نہیں لیا؟ بہرحال، اسے بڑھتی آبادی کے بحران اور پنشن فنڈ کے بحران کا سامنا ہے جو ریٹائرمنٹ کی عمر میں اضافہ کرنے والے دیگر ممالک کے مقابلے میں کم خوف ناک نہیں۔ جب ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار سنبھالا، اس وقت چین میں اوسط متوقع عمر ۳۵ سال سے بڑھ کر اب ۷۷ سال پر جا پہنچی ہے جو او ای سی ڈی ممالک میں آبادی کی اوسط عمر سے تین سال کم ہے۔ ۶۰ سال سے بڑی عمر کے افراد کل آبادی کے پانچویں حصے سے زائد ہیں۔ ۲۰۳۵ء تک یہ شرح ایک تہائی کے قریب پہنچ جائے گی۔

دوسری جانب کام کرنے کی عمر والی آبادی (جس سے پنشن کی رقم حاصل کی جاتی ہے) گھٹ رہی ہے۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ صورتحال یہی رہی تو ۲۰۳۵ء تک ریاست کے پنشن فنڈ میں، جس پر ریٹائرڈ افراد تکیہ کرتے ہیں، پیسہ نہیں بچے گا۔ ناقدین اصلاحات کی جانب سے اٹھائے گئے خدشات کی گونج شاید پالیسی سازوں کو سنائی دے رہی ہے۔ بہت سے گھروں میں ریٹائرڈ افراد بچوں کی دیکھ بھال کا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک تبصرہ یہ کیا جاتا ہے کہ انھیں طویل عمر تک کام میں مشغول رکھنے سے نوجوان جوڑے بچے پیدا کرنے میں دلچسپی کم کر دیں گے۔

ریٹائرمنٹ کی عمر میں اصلاحات کے حوالے سے ایک اور اعتراض یہ سنا جاتا ہے کہ بڑی عمر کے افراد کو زیادہ عمر تک کام پر مجبور کرنے سے نوجوانوں کے لیے روزگار کا حصول مشکل ہو جائے گا۔ چین میں نوجوانوں میں بے روزگاری حیران کن حد تک زیادہ ہے، یہ جون ۲۰۲۳ء تک شہری علاقوں میں ۲۱ء۳ فیصد تک جا پہنچی ہے۔ پھر حکومت نے اپنے حساب کتاب میں کئی ماہ صرف کیے اور کچھ کم خطرناک اعداد و شمار پیش کیے۔ جولائی میں یہ شرح ۱۷ء۱ فیصد تھی۔ لیکن ریٹائرمنٹ کی عمر بڑھانے کے قانون کے خلاف یہ دلیل بہت کمزور ہے زیادہ عرصہ کام کرنے سے زیادہ خرچ کی حوصلہ افزائی ہوگی جس سے معیشت بڑھے گی اور روزگار پیدا ہوگا۔

اگر کوئی نوجوانوں کی بے روزگاری کے لیے فکرمند ہے تو ایسے لوگ بھی ہیں جو اس لیے بھی پریشان ہیں کہ ریٹائرمنٹ کی عمر بڑھانے سے بزرگوں کو بھی یہی مسئلہ درپیش ہوگا۔ چین میں عمر کی بنیاد پر امتیازی سلوک عام ہے، سرکاری نوکری جیسی محفوظ نوکری کرنے والوں کے لیے تو دیر تک کام کرنا اچھا

ثابت ہوسکتا ہے لیکن پرائیویٹ سیکٹر میں کام کرنے والوں کو ریٹائرمنٹ کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی زبردستی ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا کیونکہ ان کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ یہ بہت بوڑھے ہوچکے ہیں۔ سوشل میڈیا پر تبصرہ کرنے والے افراد سرکاری ملازمین کے بارے میں یہ بھی سوچتے ہیں کہ ان کی پنشن بہت زیادہ ہے۔

اس بحث کے دوران آبادی کے ایک بڑے حصے کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ نصف سے زیادہ چینی شہری دیہی hukou رکھتے ہیں۔ یہ ایک خاص گھریلو رجسٹریشن ہے جس میں ۳۰ کروڑ یا اس سے زیادہ لوگ شامل ہیں جو کام کی غرض سے دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف منتقل ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ صرف اس پنشن کے حق دار ہیں جو شہریوں (urbanites) کی حیثیت سے رجسٹرڈ لوگوں کو دی جانے والی رقم کے ایک چھوٹے سے حصے کے برابر ہے۔ یہ اوسطاً ۲۰۰ یوآن (۲۸ ڈالر) ماہانہ ہے۔ جس میں کسی تبدیلی کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ huko رکھنے والے بہت سے دیہی افراد کے لیے قابل پنشن عمر ۶۰ سال رہے گی۔ ویبو کے ایک صارف نے اس حوالے سے خاموشی کی ایک وجہ یہ بتائی کہ ”اگر پنشن کو کل آبادی میں بہ شمول کسان برابر تقسیم کر دیا جائے تو میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تمام لوگوں کی پنشن موجودہ پنشن سے کم ہوگی“۔

(ترجمہ: سید عرفان احمد)

"Anger abounds as China raises its strikingly low retirement age". ("Economist". Sept 17, 2024)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020

حزب اللہ سربراہ کی شہادت کے علاقائی سیاست پر اَثرات

منصور جعفر

بظاہر کہانی یہ بھی ایک فرد کی ہے، جو کیلنڈر کی چند تاریخوں ۱۹۶۰ء، ۱۹۸۲ء، ۱۹۹۲ء، ۲۰۰۶ء، ۲۰۱۱ء، ۲۰۲۳ء اور ۲۰۲۴ء کے ماہ و سال کے اندر محدود ہے۔ حقائق کے وسیع سمندر میں من کے چھوٹے سے جزیرے کی تنگنائی اسے اس کیلنڈری تنگنائی سے باہر جانے دینے میں حائل رہی تو کہانی اتنی سی ہی لگے گی۔

مگر بہ انداز دیگر دیکھا جائے اور چشم بینا کو سمندر کی وسعت کی طرح وسیع کر لیا جائے تو معاملہ ایک فرد اور کیلنڈر کی چند تاریخوں تک محدود رہنے کا نہیں رہتا بلکہ تاریخوں کی تنگنائی سے نکل کر تاریخ پر پھیل جاتا ہے۔ کبھی ایک تاریخ بن کر دکھتا ہے، کبھی ایک محور کی تاریخ اور کبھی تاریخ کا محور۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ اس نے ۱۹۶۰ء میں لبنان کے ایک غیر معروف سے گھرانے میں جنم لیا، کچھ سال عراق میں تعلیم پائی، ۱۹۸۰ء کی دہائی شروع ہوئی تو بہت سوں کی طرح یہ بھی لبنانی خانہ جنگی کا ایک رکن بن گیا۔ مگر بس ایک رکن کی طرح رکن بن کر رک نہیں گیا۔ اس نے ۱۹۸۲ء میں اسی انقلابی لہر کو شعوری طور پر قبول کیا، جو ایران میں پچھلی دہائی میں ابھری تھی۔ اب اس انقلاب کے بعد بدلی ہوئی سوچ کے ساتھ پاسداران انقلاب کا لبنان میں پاسدار بن گیا اور ۱۹۸۲ء میں حزب اللہ سے جڑ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ نصر اللہ ہی حزب اللہ بن گیا۔

۱۹۹۲ء میں حسن نصر اللہ نے اپنے پیشرو کی اسرائیل کے ہاتھوں شہادت کے بعد حزب اللہ کی قیادت سنبھالی اور پھر اسرائیلی بمباری کے نتیجے میں بیروت کے جنوبی مضافات میں ۲۷ ستمبر کو خود بھی نشانہ بن گئے، گویا یہ مزاحمتی تحریک کے ایسے مسند پر بیٹھنا تھا کہ جس میں خون دیا جاتا ہے۔ جس پر بیٹھنے والے کو جان دینا پڑتی ہے اور جس کا مسند نشین، قربانی سے پیچھے نہیں ہٹتا۔

حسن نصر اللہ نے حزب اللہ کی قیادت پر فائز رہتے ہوئے تقریباً ۳۲ سال گزارے۔ مگر محض گزار نہیں دیے۔ اپنے ایک ایک ماہ و سال کا حزب اللہ، اس کے گرد و پیش اور پورے لبنان کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ پر اثر ثبت کر دیا۔ حسن نصر اللہ، حزب اللہ، مزاحمت اور اسرائیل دشمنی یہ تمام الفاظ ایک دوسرے کا استعارہ بن گئے۔

حسن نصر اللہ اب اس دنیا کا رزق کھانے والوں میں شامل نہیں رہے۔ اس سے پہلے ان کے بے شمار ساتھی اور جواں سال بیٹا اس جہاں سے اسی مزاحمتی راستے پر چلتے چلتے جان سے گزر چکے ہیں۔ اب نوعمر بیٹی زینب نے بھی باپ کے ساتھ جان پیش کر دی ہے۔

حزب اللہ کے حسن نصر اللہ کے ساتھ لاکھ اختلاف سہی ان کے دعوے، ان کی قربانی اور ان کے اسلوبِ قربانی کے سامنے اختلاف کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ کسی کو انانیت و فرعونیت کی چاٹ یا خدانخواستہ اسرائیلیت کی چھاپ لگ چکی ہو۔

جمعہ کے روز اسرائیل نے اس بدترین بمباری میں حسن نصر اللہ کو ٹارگٹ کیا، جس کی منظوری اسرائیلی وزیر اعظم بن یامین نیتن یاہو نے اقوام متحدہ کے سر پر سوار ہو کر اور اپنے اولین سرپرست و اتحادی امریکا کی گود میں بیٹھ کر دی تھی۔ نیتن یاہو اس کے بعد امریکا میں اپنا قیام مختصر کر کے واپس اسرائیل لوٹ گیا۔

حملے کے لیے چنے گئے وقت سے متعلق جو خدشات ظاہر کیے جا رہے ہیں انہیں دیکھ کر امریکا کی خطے میں کشیدگی کم کرنے کی کوششوں اور خواہش کی پائیداری بھی محل نظر لگتی ہے۔ خاص طور پر اسرائیل کے جاری فوجی آپریشنز کو دیکھتے ہوئے یہ سارا عمل ہی مشکوک دکھائی دیتا ہے۔

حسن نصر اللہ قبلہ اول، فلسطین اور فلسطینی مزاحمت کار اتحادیوں کے لیے لڑتے لڑتے چلے گئے۔ جاں سے گزر گئے مگر اپنی ساری زندگی اسی راستے اور منزل کے نام کر دی۔ پورے استقلال و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کبھی اضمحلال کو اپنے اوپر طاری کیا نہ خوف نے انہیں آن پکڑا۔ حزب اللہ کو بناتے بناتے مزاحمت کا حوالہ بن گئے۔ مزاحمت کی تاریخ رقم کر گئے۔

محض جذباتیت کی بنیاد پر جیے، نہ حزب اللہ کو رہنے دیا۔ بلکہ تحریک مزاحمت بنا دیا۔ ایک ایسی تحریک مزاحمت جو دوسروں کے چندوں پر چلنے پر مجبور ہوئی نہ جدید ترین وسائل میں کسی کی احتیاج اس کی مجبوری رہی۔

وہ ماضی کی درخشاں تاریخ سے جڑے رہے۔ مگر پوری

طرح آج میں رہے۔ مراد یہ کہ جدت کو شدت سے چاہا۔ سرعت سے اپنایا۔ صلاحیت کو کمال تک پہنچایا۔ علم کو نافع بنایا۔ عمل کو ہتھیار کے طور پر اپنایا اور مستقبل کو نشان منزل دکھایا۔ قلم، کتاب، مائیک اور کیمرہ بھی ان کے ہتھیاروں میں اسی طرح شامل رہے جس طرح انہوں نے توپ وتفنگ اور میزائلوں کو اپنی دسترس میں کیا۔

حسن نصراللہ کا تعلق لبنان سے تھا، لبنان میں رہے، لبنان میں جیے اور لبنان سے ہی ابدی زندگی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ایک عرب کے طور پر لبنان ہی نہیں فلسطین کاز کے ساتھ روز اول سے کھڑے رہے۔

کیا بیروت کے جنوبی مضافات میں حزب اللہ کے ہیڈکوارٹرز کی اسرائیلی بمباری سے تباہی اس تصور مزاحمت کو ملیا میٹ کرسکے گی؟ یہ سوال اہم ہے مگر اس کا جواب ہاں نہیں ہے۔

حسن نصراللہ جو اپنے خاندان، بھائیوں اور رشتہ داروں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ مگر اپنے کاز سے بدرجہ اتم جڑے ہوئے تھے۔ ان کی ساری کدوکاشت، تگ و دو، جہد اور سعی استعداد جمع کرنے کی تھی۔ اپنی نہیں اپنے کاز کی فکر کے لیے گھلو، اپنے کاز کے لیے جیو، اپنے کاز کے لیے جان دو۔

ان کے بقول ایک لاکھ سپاہ ان کی حزب اللہ سے وابستہ ہے۔ جس کے لیے جدید ترین اسلحہ تک دسترس انہوں نے آسان تر بنادی۔ لبنان کے اندر اور لبنان سے باہر گردوپیش میں حزب اللہ کے نظریے اور راستے کے لوگ جگہ جگہ موجود ہیں۔ کیا اسرائیل کا ایک چھوٹا سا جزیرہ اپنے اردگرد پھیلے سمندر میں چین کی نیند سو سکے گا...... اس پر خود اسرائیل کی نیندیں اُڑی جاتی ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی کارروائی کرنے کے بعد اسرائیل پر کوئی خبط سا سوار ہوگیا ہو اور اسے یہ نشہ سا محسوس ہو رہا ہو کہ وہ کامیاب ہوگیا۔ مگر کسی ریاست کی کامیابی کا یہ معیار آج تک قرار نہیں پایا کہ وہ ہمہ وقت جنگ میں رہے۔ جنگی جہازوں سے اپنے آس پاس بم گراتی رہے۔ ہمسایوں پر ٹینک چڑھاتی رہے اور دنیا بھر میں پھیلے اپنے شہریوں کو خطرات میں مبتلا کرتی رہے۔ یہ کر کے اسرائیل اور اس کا نیتن یاہو ایک دو سال تو کسی غلط فہمی یا نشے میں رہ کر خوش رہ سکتے ہیں۔ تاہم دنیا کی حقیقتیں اس سے بہت مختلف اور طویل مدتی ہیں۔ دنیا کے ساتھ تجارت، سفارت اور امن کے ساتھ رہنا پڑتا ہے جو اسرائیلی سوچ کے نقشے پر فی الحال دور دور تک نہیں ہے۔

جیسا کہ نیتن یاہو نے اپنے تازہ بیان میں کہا ہے کہ 'اسرائیل کا مشن ابھی پورا نہیں ہوا۔ آنے والے دن مزید کچھ لے کر آئیں گے...... خطے میں توازن کو بدلنے کے لیے حسن نصراللہ کو ختم کرنا ایک ضروری شرط تھی'۔ گویا ہدف حسن نصراللہ نہیں تھے، ہدف پورے خطے میں توازن اسرائیل کے تابع رکھنا ہے۔ جو خطے کی تمام مملکتوں کے لیے بھی ایک نیا پیغام ہے۔

حسن نصراللہ نے جس حماس اور جن فلسطینیوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے لبنان اسرائیل سرحد پر نپی تلی سی کوشش شروع کر رکھی تھیں وہ اس وقت کی ضرورت تھی۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب نئی قیادت اور نئے فیصلے ہوں گے۔ طاقت اور چیلنج کو از سر نو تولا اور ناپا جائے گا۔ جو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا اور پھیل چکا ہے۔

ایران کو بھی اپنے لیے ایک راستہ متعین کرنا ہوگا اور آس پاس کے دیگر عرب و عجم کے باسیوں کو بھی اپنے مقدر کا فیصلہ خود کرنے کا راستہ ہی بالآخر دیکھنا پڑے گا کہ انہوں نے اپنا نام قاتل نیتن یاہو کی فہرست میں لکھوانا ہے یا مقتول حسن نصراللہ والی استقامت، عزت اور شہادت سے مزین فہرست میں۔

بلاشبہ وسائل کی کمی نہیں۔ فہم وادراک بے مثال ہے۔ افرادی قوت لاجواب ہے۔ مشرق وسطیٰ کے پاس بہت کچھ ہے۔ مشرق وسطیٰ اور اس سے جڑی مسلم دنیا کا ایک وسیع سمندر ہے۔ شاید اب بھی وقت ہے کہ مشرق وسطیٰ کا یہ خطہ مل کر یورپی ریاستوں کو الگ الگ کر کے ان کے ساتھ ڈیل کرتے ہوئے سفارت وتجارت کو نیا رخ دے۔ ہاں ماضی سے ذرا ہٹ کر۔

اسرائیل نے بیروت میں نائن الیون کے انداز میں مشرق وسطیٰ کے لیے نائن ٹو سیون کر دیا ہے۔ نائن الیون قبول نہیں تو نائن ٹو سیون کیوں کر قبول کیا جا سکے گا۔ یہ آج بیروت میں ہوا ہے تو کل کہیں اور بھی کوشش ہوسکتی ہے جیسا کہ پورے خطے میں توازن نیتن یاہو کا مقصد قرار پا چکا ہے۔

لبنان کے بعد لبنان سے جڑا ہوا کوئی ملک اور پھر اس سے اگلا ملک اور پھر اگلا ملک کہ اسرائیل کی حدود تو ابھی اسرائیلیوں نے لامحدود رکھی ہیں۔ تو کیوں نہ سارا مشرق وسطیٰ اسرائیل کے ذریعے بروئے کار اس نائن الیون اسٹریٹیجی کو روکنے کے لیے باہم شیر وشکر ہو جائیں کہ جتنا اسلحہ اور ہتھیار حزب اللہ کو حسن نصراللہ دے گئے ہیں۔ جو تنظیم اور تربیتی نظام فراہم کر گئے ہیں وہ صرف ہیڈکوارٹر کے طاقچوں اور حسن نصراللہ کے دماغ تک محدود نہیں تھا۔

سید حسن نصراللہ کی اسرائیلی حملے میں موت سے خطہ سیاسی اور عسکری کشیدگی کے نئے مرحلے میں داخل ہونے جا رہا ہے۔ اس صورت حال کے ملکوں کی داخلی پالیسیوں اور ان کے اتحادیوں پر دور رس نتائج ہونے کے قوی امکانات دکھائی دیتے ہیں۔

یہ اہم واقعہ خطے کے سیاسی، عسکری اور سیکیورٹی منظرنامے میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کا باعث بن سکتا ہے، جو آگے چل کر علاقائی اتحادوں اور تنازعات کے نقشوں میں تبدیلی کا موجب بھی ہوسکتا ہے۔

راقم الحروف کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اسرائیل کا حزب اللہ کے مرکزی دفتر پر فضائی حملہ صرف حسن نصراللہ کی زندگی کے خاتمے کا ہی باعث نہیں بنا بلکہ اس سے دونوں فریقوں کے مابین مقابلے کے قواعد وضوابط بھی تبدیل ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اس ہائی پروفائل قتل سے پیدا ہونے والے مضمرات کے ڈانڈے ایک جامع علاقائی جنگ سے ملتے دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔۔ الحفیظ الامان!

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۹ ستمبر ۲۰۲۴ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی نئی پیشکش

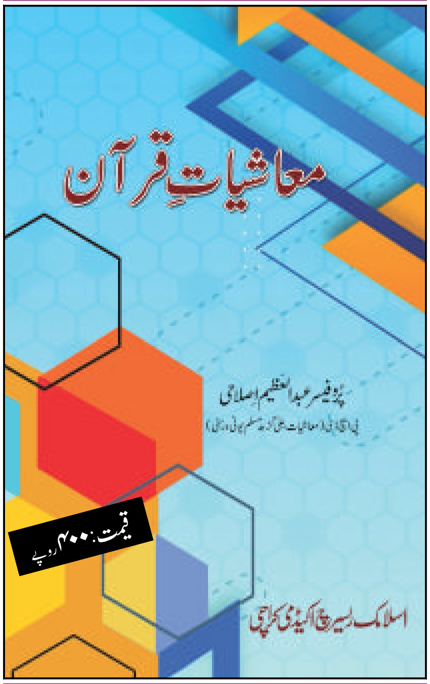

اکیڈمی بک سینٹر، D-35، بلاک-5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

قلم، کتاب، طلبہ، اسکول سب پر اسرائیلی بمباری

نجم الحسن عارف

غزہ میں ایک سال سے جاری جنگ نے تقریباً دو تعلیمی سال نگل لیے ہیں۔ تعلیمی انفرااسٹرکچر کا نقصان اس کے علاوہ ہے جس کی بحالی میں کئی سال لگ سکتے ہیں جبکہ لاکھوں کی تعداد میں بچوں کی کتابیں ملبے کا حصہ بن گئی ہیں۔ قیمتی اساتذہ اور ہونہار طلبہ و طالبات جو سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں اس جنگ کے دوران شہید ہوگئے ہیں، وہ اب کبھی واپس نہ آسکیں گے۔

ایک سال کے دوران جنگ دو تعلیمی سال کیوں کر نگل گئی؟ غزہ کے تعلیمی سال کا آغاز عام طور پر ماہ ستمبر کی ۱۰ تاریخ سے ہوتا ہے۔ پچھلے سال ابھی مشکل سے تعلیمی سال کا آغاز ہوا تھا کہ اسرائیل کی غزہ میں جنگ شروع ہوگئی۔ ہر طرف امریکی ساختہ اسرائیلی جنگی طیاروں کی بمباری کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ آج تک جاری ہے۔

غزہ کی وزارتِ تعلیم کے مطابق اب تک ۹۰ فیصد اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بمباری سے تباہ ہوگئی ہیں۔ اب ان کی ازسرِنو تعمیر کی ضرورت ہوگی۔ پچھلے سال ۵۸ ہزار کی تعداد میں جن بچوں کی تعلیمی سال کے لیے پہلی جماعت میں رجسٹریشن ہوئی تھی وہ بھی تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور بڑی جماعتوں میں رجسٹرڈ بچوں میں تقریباً سبھی کا تعلیمی سال اسرائیلی بمباری کی زد میں آگیا۔ بتایا جا رہا ہے کہ 'انروا' نے ۴۵ خیموں میں اساتذہ کی مدد سے کچھ تعلیمی سرگرمیوں کے لیے اہتمام کیا ہے۔ یقیناً یہ ناکافی تعداد ہے۔

اسرائیلی فوج نے ۴۸۹؍اسکولوں اور دیگر تعلیمی اداروں بشمول جامعات کو بمباری کا نشانہ بنایا۔ جن میں سے ۱۲۲ مکمل تباہ ہوکر ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ جبکہ جزوی تباہ ہونے والے ۲۳۱؍اسکولوں کے بچے کھچے کمروں اور گراؤنڈز میں بے گھر فلسطینیوں نے پناہ لے لی ہے۔ اس لیے امسال بھی زیادہ تر طلبہ و طالبات کا تعلیمی سلسلہ متاثر ہوسکتا ہے۔ 'انروا' جس کے مجموعی طور پر اہلکاروں کی تعداد ۳۰ ہزار ہے اور صرف غزہ میں ۱۳؍ہزار انروا کارکن سرگرم ہیں نے تعلیمی شعبے میں بھی فلسطینیوں کے لیے جگہ جگہ اسکول قائم کیے مگر اس پر بھی اسرائیلی بمباری کا سلسلہ مسلسل جاری ہے۔

واضح رہے اسرائیل نے اقوامِ متحدہ کے اس ادارے 'انروا' کے ۱۲؍کارکنوں پر الزام لگایا کہ انہوں نے ۷؍اکتوبر کو اسرائیل پر حملے میں حماس کی مدد کی تھی۔ ۱۳؍ہزار کارکنوں میں سے ۱۲ پر ماہ جنوری میں یہ الزام لگا اور اس الزام کے لگتے ہی 'انروا' پر اسرائیل اور اس کے اتحادی چڑھ دوڑے۔ اس کو سزا دینے کے نام پر درحقیقت غزہ کے جاں بہ لب زخمیوں سے دوائیں، پانی اور کھانا چھینا گیا اور بے گھر فلسطینیوں کو عارضی شیلٹر سے بھی محروم کرنے کی ایک اور سازش کو آگے بڑھایا گیا۔ سب سے پہلے امریکا نے 'انروا' کے لیے اپنی امداد بند کردی تاکہ یہ غزہ میں کام کرنے سے معذور ہوجائے۔

بہرحال واپس فلسطینی اسکولوں کی طرف آتے ہیں۔ غزہ کے ساتھ ۷؍اکتوبر کے بعد مقبوضہ مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم میں بھی اسرائیلی فوج نے تعلیمی اداروں جن میں اسکول اور یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں پر حملے کیے ہیں۔ مجموعی طور پر ایسے واقعات کی تعداد ۲ ہزار ۳۵۴ ہے جس سے تعلیمی اداروں کے طلبہ و طالبات اور اساتذہ متاثر ہوئے، یعنی زخمی یا شہید ہوئے ہیں۔ وزارتِ تعلیم فلسطین کے مطابق اسرائیلی فوج کی یہ ۲ ہزار ۳۵۴ کارروائیاں تعلیمی اداروں کے اندر اور قرب و جوار کے علاقوں میں کی گئی ہیں۔

بلاشبہ طلبہ کی یہ تعداد وہ ہے جو رجسٹرڈ طلبہ ہیں اور جن کے بارے میں معلوم ہوسکا ہے۔ تاہم اس کے علاوہ بھی نوجوانوں اور بچوں کی غالب تعداد کو اسرائیلی فوج نے غزہ کے ساتھ ساتھ مقبوضہ مغربی کنارے میں نشانہ بنانا شروع کر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے نوعمر بچے حتیٰ کہ شیرخوار بچے بھی غزہ میں جاری اسرائیلی جنگ میں سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں اسرائیلی بمباری اور گولہ باری سے زخمی یا قتل ہونے والوں کی بھی بڑی تعداد انہی بچوں اور نوجوانوں کی ہے جو کل تعداد کا ۴۱ فیصد بنتے ہیں اور جسمانی طور پر معذور ہونے والے بھی زیادہ تر اسی طبقے کے نمائندہ ہیں۔

انسانی حقوق کے ممتاز ادارے 'ہیومن رائٹس واچ' کے طویل عرصے تک سربراہ رہنے والے کینتھ روتھ کے مطابق 'اسرائیل کی غزہ میں مسلسل ناکہ بندی اہلِ غزہ کو اجتماعی سزا دینے کے مترادف ہے۔ بلاشبہ اسرائیلی فوج نے اس اجتماعی سزا کا اولین ہدف فلسطینی یوتھ کو بنا رکھا ہے۔ یہ اسرائیلی کی طویل مدتی حکمت عملی کا بھی اہم ترین حصہ ہے کہ فلسطینیوں کے بچوں کو قتل یا معذور بنا دیا جائے اور جو بچ جائیں انہیں تعلیم سے محروم رکھنے کے لیے ہر طریقہ اختیار کیا جائے۔

اس سلسلے میں اسرائیلی سازش اور کوشش اپنی جگہ مگر مسلم دنیا کے حکمران اور فیصلہ ساز اپنے ہاں تعلیمی اداروں میں فلسطینی بچوں اور طلبہ کے لیے فوری طور پر اچھی تعلیمی پیشکشوں کا اعلان اور اہتمام کر سکتے ہیں کہ عرب دنیا کے ساتھ ساتھ ایشیا کے دیگر ملکوں کے تعلیمی اداروں میں ایسے بے شمار مواقع ہیں۔

جن ملکوں کو اللہ نے زیادہ مال و دولت سے نوازا ہے مگر وہ اس سے فلسطینیوں کی مدد کسی اور طریقے سے بوجوہ نہیں کر سکتے وہ فلسطینی طلبہ کے لیے اپنے تعلیمی اداروں کے دروازے تو کھول سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے لازم ہے کہ وہ پہلے اپنے دلوں پر پڑے قفل کھولیں، استعمار کے خوف کو قفل لگائیں اور اسے زنجیروں سے جکڑ دیں۔

اس مقصد کے لیے بھی مغربی دنیا اور امریکا کی طرف دیکھنا اور بین الاقوامی اداروں سے مطالبات پر مبنی قرار دادیں ہی منظور کراتے رہنا مزید کم ہمتی کا اظہار ہوگا۔

بقیہ:

لبنان میں پیجر دھماکے

موساد کے دو خفیہ افسروں نے مشال کی گردن پر زہر چھڑکا تھا۔ مگر یہ منصوبہ ناکام ہوگیا اور یہ دونوں ایجنٹ پکڑے گئے۔ حماس کے لیے ہتھیار فراہم کرنے والے محمود المجوح ۲۰۱۰ء میں دبئی کے ہوٹل کے کمرے میں مردہ پائے گئے تھے۔ اماراتی حکام نے ابتدائی طور پر اسے قدرتی وجوہات کی بنا پر موت قرار دیا تھا، مگر بعد کی تحقیقات میں موساد کی ایک ہٹ ٹیم کی سی سی ٹی وی فوٹیج کا پردہ فاش ہوا۔

سال ۲۰۱۰ء اور ۲۰۲۰ء کے درمیان، تقریباً نصف درجن ایرانی جوہری سائنسدان بندوقوں کے حملوں یا دھماکوں میں ہلاک یا زخمی ہوئے۔

ایران کے چیف جوہری سائنسدان محسن فخرزادہ کو ۲۰۲۰ء میں تہران کے مضافات میں ایک قافلے میں گاڑی چلاتے ہوئے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ کچھ ایرانی میڈیا رپورٹس میں کہا گیا ہے کہ اسرائیل نے سیٹلائٹ سے کنٹرول کرنے والی اسنائپر رائفل کا استعمال کیا۔

(بحوالہ: روزنامہ '۹۲ نیوز' لاہور۔ ۲۵ ستمبر ۲۰۲۴ء)

مسیحؑ کے دشمن، فلسطینی مسیحاؤں کے بھی دشمن ٹھہرے

نجم الحسن عارف

غزہ میں اسرائیلی جنگ کو نسل کشی قرار دینے کا بین الاقوامی برادری ہی نہیں بین الاقوامی عدالت انصاف کئی پہلوؤں سے جواز رکھتی ہے۔ ایک پہلو اسرائیلی فوج بھی ہے جس کی تربیت، معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اقدار و روایات اور بین الاقوامی قانون کے برعکس کی جاتی ہے۔

بچے، بوڑھے، خواتین، سماجی و شہری انفراسٹرکچر جس میں پانی، بجلی اور ایندھن کی فراہمی میں رکاوٹیں ڈالنا، کھانے پینے کی اشیا کی نقل و حمل کو روکنا ہی شامل نہیں، ادویات اور طبی آلات کی فراہمی میں بھی حتی الامکان رکاوٹ ڈالنا اسرائیلی فوج کی جنگی حکمت عملی کا خاصہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسرائیلی فوج نے فلسطینیوں کے خلاف غزہ میں جنگ کے دوران اسپتالوں اور طبی آلات کی فراہمی کے اداروں کو بھی نشانے پر لے رکھا ہے۔

اسرائیل اور اس کی فوج کے منہ کو جو خون غزہ اور مغربی کنارے کے فلسطینیوں کا لگ چکا ہے اس کے اثرات آس پاس تک کس قدر خون آشامی لیے ہوں گے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اسرائیل کی غزہ جنگ کے دوران غزہ کے اسپتالوں پر تقریباً ایک سال کے دوران بیتنے والے حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔

۷/اکتوبر کو غزہ پر جارحیت کے آغاز کے ساتھ ہی اسرائیلی فوج کی طرف سے اندھا دھند اور بلا امتیاز بمباری کا ایسا آغاز ہوا کہ جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم کی اسٹریٹجک بمباری کی تاریخ غزہ کی اس بستی پر دہرانا شروع کر دی جس کو تقریباً ڈیڑھ دہائی سے دنیا کی سب سے بڑی کھلی جیل کا ٹائٹل ملا ہوا ہے۔ جہاں کھانے پینے کی اشیا تک اسرائیلی فوج کی چھلنیوں سے گزر کر جاتی ہیں۔ جس کی معیشت اپنی ہے نہ جس کے پاس کوئی باضابطہ تربیت یافتہ فوج موجود ہے۔

بہرحال ۷/اکتوبر سے ہی بدترین اور اندھا دھند بمباری کی زَد میں جہاں اور سب کچھ آیا، وہیں غزہ کے اسپتال بھی اس کے خاص نشانے پر تھے۔ اسپتالوں پر بھی بمباری کا جواز پیش کرنے کے لیے اسرائیلی فوج نے استدلال چند دن کی تاخیر سے گھڑنا شروع کیا اور ۲۷/اکتوبر کے قریب جا کر کہنا شروع کیا کہ حماس غزہ کے اسپتالوں کو 'کمانڈ اینڈ کنٹرول سینٹر' کے لیے استعمال کرتی ہے۔ اسرائیلی فوج اس وقت تک گا ہے گا ہے غزہ کے ۱۴ کے قریب اسپتالوں کو نشانے پر لے چکی تھی۔ ان میں غزہ کا سب سے بڑا اسپتال الشفاء اور القدس بھی شامل تھے۔ اسی دوران دو اسپتال بمباری سے مکمل تباہ کر دیے گئے۔ ۱۴/اکتوبر کو اسرائیلی فوج نے ایک حکم جاری کیا جس میں شمالی غزہ کے ۲۲/اسپتالوں کے عملے اور ان میں داخل مریضوں اور زخمیوں کو اسپتال خالی کرنے کا کہہ دیا۔

کوئی بھی شخص جو انسانیت اور انسانی اقدار پر کسی قدر یقین رکھتا ہو، اور اسرائیل یا اس کے بیانیے کا اندھا معتقد یا مقلد نہ ہو، اسے یہ تصور کرنا بہت بوجھل اور تکلیف دہ لگے گا کہ فوجی حکم کے تحت اسپتال خالی کرائے جا رہے ہیں۔ مریضوں اور زخمی افراد کے لواحقین ان کی وھیل چیئرز کو گھسیٹ کر یا اسٹریچرز کو اٹھا کر دوسرے اسپتالوں میں لے کر بھاگ رہے ہیں۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ جس اسپتال جانے کی کوشش میں ہیں وہاں ان کے پیارے کو داخل کیا جا سکے گا یا نہیں۔

اہم بات یہ تھی کہ ان مریضوں میں ایسے بھی تھے جو آئی سی یو میں تھے، آکسیجن والے سلنڈر سے منسلک تھے یا وینٹی لیٹر پر تھے، بیہوش تھے یا زخموں سے چُور تھے۔ لواحقین کو اپنے پیاروں کی اس بے بسی کی زندگی میں ہی انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جانا تھا۔ بصورتِ دیگر اسرائیلی فوج کی بمباری کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اسی دوران ۳۰/ اور ۳۱/اکتوبر کی درمیانی رات اسرائیلی فوج نے اپنی بمباری کے لیے ترک فلسطین دوستی اسپتال کو منتخب کیا۔ بمباری سے اسپتال کو اتنا نقصان پہنچا دیا کہ اس کے لیے اپنی طبی خدمات جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ ادویات، آلات اور بجلی و ایندھن کا نظام اسرائیلی فوج پہلے ہی برباد کر چکی تھی۔ یکم نومبر ۲۰۲۳ء کو یہ اسپتال بند ہو گیا۔

۱۲/نومبر تک اسرائیلی فوج نے اسپتالوں پر بمباری، حملوں، اسپتالوں پر فائرنگ اور ان کے محاصروں کی حکمت عملی کے تحت ۱۳۷ حملے کیے تھے۔ ان حملوں کی زَد میں بڑے اسپتالوں کے علاوہ پرائمری صحت مراکز بھی آئے۔ 'ہیومن رائٹس واچ' نامی بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والے ادارے نے اپنی ۱۴/نومبر کو جاری کردہ رپورٹ میں اسپتالوں پر اسرائیلی فوج کی دہشت گردانہ بمباری کا ذکر کیا ہے۔ تاہم ساتھ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ حماس کی جانب سے اسپتالوں کو اپنے عسکری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے اسرائیلی فوج کے دعوے کی تصدیق نہیں ہوئی۔

اس رپورٹ کے مطابق ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء سے ۷ نومبر ۲۰۲۳ء تک اسرائیلی فوج نے (اپنے بڑے اتحادیوں کی مہربانی و تعاون سے) غزہ میں قائم انڈونیشیا اسپتال، ترک اسپتال اور القدس اسپتال کو کئی بار نشانہ بنالیا تھا۔ ۳ نومبر کو غزہ کا سب سے بڑا الشفاء اسپتال بھی بمباری کی زد پر آ گیا۔

ماہ مارچ میں الشفاء اسپتال کے لیے اسرائیلی فوج کی دہشت گردانہ حکمت عملی اور زیادہ دہشت گردانہ انداز اختیار کر گئی۔ بمباری کے علاوہ الشفاء اسپتال کو اس کے طبی عملے، ڈاکٹروں اور مریضوں سمیت ٹینکوں کے محاصرے میں لے لیا گیا، یہ محاصرہ کم و بیش ۱۰ دن جاری رکھا گیا۔ بجلی پانی کاٹ کر، مریضوں، زخمیوں اور طبی عملے کو فائرنگ اور تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے اسرائیلی فوج اُن یرغمالیوں کو تلاش کر رہی تھی، جن کی تلاش میں ابھی تک غزہ کی پٹی اسرائیلی فوج کے لیے صحرائے سینا بنی ہوئی ہے۔ اسرائیلی فوج ماری ماری پھر رہی ہے مگر تمام تر کوششوں کے بعد بھی یرغمالی اس کے ہاتھ نہیں آ رہے۔

الشفاء پر اسی جنگی یلغار کے دوران اسرائیلی فوج نے ہلاک کیے گئے درجنوں فلسطینیوں کے لیے اجتماعی قبروں کا راستہ کھولا جن کی دریافت بعد میں انسانی حقوق سے متعلقہ اداروں اور بین الاقوامی فوجداری عدالت کی ٹیموں نے کی۔

اسپتالوں، ڈاکٹروں، طبی عملے، ادویات اور طبی آلات کے خلاف اپنی جنگ کے حصے کے طور پر اسرائیلی فوج اب تک سیکڑوں ڈاکٹروں اور طبی عملے کو قتل کر چکی ہے۔ ۲۵ جون ۲۰۲۴ء تک ان قتل کیے گئے فلسطینی مسیحاؤں کی تعداد ۵۰۰ ہو چکی تھی۔

ایک رپورٹ کے مطابق ۲۵ جون تک اسرائیلی فوج نے ہر روز طبی عملے کے ۲/ارکان یا ڈاکٹروں کو قتل کیا۔ جون کے اواخر تک تمام فلسطینیوں کے قتل کے حوالے سے یہ تعداد اس طرح تھی کہ ہر ۴۰ فلسطینیوں کے قتل کے ساتھ طبی عملے کا ایک رکن قتل کیا جا رہا تھا۔ ایمرجنسی وارڈز کے کارکن و ڈاکٹر ہی نہیں ایمبولینس سروس سے متعلق فلسطینی عملے کے ارکان کو قتل کرنا بھی اسرائیلی فوج کی حکمت عملی میں شامل ہے۔ یہ بات غزہ میں ایمرجنسی اینڈ ایمبولینس سروس کے ڈائریکٹر ہانی الجا الفاروی نے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارے سے بات کرتے ہوئے کہی۔ بعدازاں انہیں بھی اسرائیلی فوج نے قتل کر دیا۔

بلاشبہ فلسطینی ڈاکٹروں اور طبی عملے میں اس مشکل اور جنگی گھڑی میں خدمات انجام دینے والے ہر فرد کا کوئی متبادل نہیں

ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسرائیلی فوج نے چُن چُن کر ان ڈاکٹروں کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔

الشفاء اسپتال کے آرتھوپیڈک ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ڈاکٹر سرجن عدنان ابرش کو بھی اسرائیلی فوج نے قتل کیا۔ مگر اس کے لیے پہلے انہیں حراست میں لیا۔ پھر تشدد کرتے ہوئے دوران حراست ہی قتل کر دیا۔ یہی معاملہ ڈاکٹر اباد الرنتیسی کے ساتھ ہوا۔ انہیں بھی دوران حراست تشدد کر کے ہلاک کیا گیا۔ وہ کمال العدوان اسپتال میں گائنی کے شعبے کے سربراہ تھے۔ بہت سے ڈاکٹروں اور طبی عملے کے ارکان کو ان کے گھروں پر خاندان سمیت قتل کر دیا گیا۔

اسرائیلی فوج نے ۲۵ جون تک غزہ کے طبی مراکز پر لگ بھگ ۴۶۰ حملے کیے تھے۔ اب یقیناً یہ تعداد مزید بڑھ چکی ہے جس کا آگے ذکر آ رہا ہے۔ ان حملوں کی سنگینی کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ۲۵ جون سے پہلے ہی اسرائیلی فوج نے بمباری کر کے کسی بھی اسپتال کو کارآمد نہیں رہنے دیا تھا۔ کچھ مکمل بند اور کچھ انتہائی جزوی طور پر کارآمد رہ گئے۔

اب تک اسپتالوں اور طبی مراکز پر حملوں کی تعداد ۵۰۵ ہو چکی ہے۔ ۷۵۲ ڈاکٹر و طبی عملے کے ارکان قتل کر دیے گئے، ۷۸۲ زخمی ہیں جبکہ ۱۲۸ زیر حراست ہیں۔ علاوہ ازیں ۲۴۶ ایمبولینسوں پر بمباری کی گئی۔

باقی صفحہ نمبر ۴

بقیہ: استعمار سے آزادی اور حصولِ انصاف کی یقین دہانی

مختلف نقطہ ہائے نظر میں مشترکہ قدروں کی تلاش

حالاں کہ فینن، امبیڈکر، اور مولانا مودودی الگ الگ پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں اور سماجی انصاف کے چیدہ چیدہ پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہیں، مگر ان کے خیالات میں کئی مشترکہ پہلو ہیں۔ تینوں مفکرین موجودہ حکومتی ڈھانچے پر انگلی اٹھاتے ہیں اور انصاف کے حصول کے لیے تبدیلی کے نقطہ نظر کی وکالت کرتے ہیں۔ فینن کی استعمار سے آزادی پر توجہ، امبیڈکر کی ذات پات کے خلاف جدوجہد اور مولانا مودودی کی حکومت الٰہیہ کے قیام کی اپیل انصاف کے قیام کے لیے ایک جامع اور مربوط حکمت عملی کی ضرورت کو اجاگر کرتی ہے۔

تینوں مفکرین ظالمانہ و جابرانہ نظام کے خاتمے اور سماجی انصاف کے حصول میں اخلاقی بنیادوں کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کے متنوع نقطہ نظر ایک انصاف پسند معاشرے کی تشکیل کے لیے انمول بصیرت پیش کرتے ہیں، پھر چاہے فینن کی ثقافتی تجدید ہو، امبیڈکر کی قانونی و تعلیمی اصلاحات ہوں، یا مولانا مودودی کا ریاستی ڈھانچے کو حکومت الٰہیہ کے ماتحت کرنے کا تصور ہو۔

معاصر بھارت میں ذات پات، مذہب اور استعماری وراثت کا ملا جلا نظام سماجی انصاف کی جدوجہد کو تیز کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ فینن، امبیڈکر اور مولانا مودودی کی پیش کردہ بصیرتوں میں ارتباط قائم کر کے ہم ان چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے ایک ہمہ جہت نقطہ نظر اپنا سکتے ہیں۔ اس میں ثقافتی اور تعلیمی تجدید کا فروغ، قانونی اصلاحات کی وکالت اور اخلاقی اصولوں پر مبنی منصفانہ معاشی نظام کا فروغ بھی شامل ہے۔

تعلیمی و ثقافتی تجدید

اس سلسلے میں فینن سے رہ نمائی حاصل کرتے ہوئے تعلیم کے میدان میں استعماری اثرات کو ختم کر کے ثقافتی تجدید کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اس میں مقامی تعلیمی نظام کی بحالی اور ثقافتی تنوع کی قدردانی شامل ہے۔ مثال کے طور پر The Wretched of the Earth میں فینن نے جس طرح مقامی زبان و روایات کی اہمیت پر زور دیا ہے بھارت میں بھی ایسی ہی کوششوں کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس کا مطلب اسلامی تعلیم کو وسیع تر تعلیمی اصلاحات کے ساتھ مربوط کرنا ہے جو پسماندہ گروہوں کو بااختیار بنائیں اور بھارتی سیاق میں علم کی نشر و اشاعت میں اسلام اور مسلمانوں کے کردار کو اجاگر کریں۔ اس کے علاوہ دیگر تنظیمی مسائل جیسے اسکول کا ناکافی ڈھانچہ، تعلیمی نصاب میں در آئے تعصّبات اور اساتذہ کے درمیان امتیازی رویوں کا ازالہ کرتے ہوئے حقیقی معنوں میں تعلیم کی منصفانہ اور عادلانہ فراہمی کو یقینی بنانا چاہیے۔

قانونی و تنظیمی اصلاحات

امبیڈکر نے جن قانونی اصلاحات کے نفاذ پر زور دیا ہے وہ حصولِ انصاف کو یقینی بنانے میں ریاستی اقدامات کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر، بھارتی آئین کے مسودے کی تیاری میں امبیڈکر کا کلیدی کردار اور ہندو کوڈ، بل کو آگے بڑھانے کے لیے ان کی کوشش سماجی مساوات پر قانونی فریم ورک کے اثرات کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ ہم ایسی پالیسیوں کی وکالت کر سکتے ہیں جو سماجی و اقتصادی تفاوت کو دور کرتی ہیں، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرتی ہیں اور ہمہ گیر ترقی کو فروغ دیتی ہیں۔ اس میں امتیازی سلوک کے خلاف قانونی تحفظات اور پسماندہ گروہوں کے لیے یکساں تعلیمی اور اقتصادی مواقع کو فروغ دینے والی پالیسیاں بھی شامل ہیں۔

اقتصادی و معاشی انصاف

معاشی انصاف کے حصول کے لیے مولانا مودودی کے وضع کردہ اصول ایک منصفانہ اور عادلانہ معاشی نظام کی تشکیل کی کوششوں کو تحریک دے سکتے ہیں۔ اس میں ایسی پالیسیوں کا نفاذ شامل ہے جو غربت کا خاتمہ کرنے، وسائل کی مساویانہ تقسیم کو یقینی بنانے اور تجارتی میدان میں اخلاقی طور طریقوں کو بالادستی دینے کی ضمانت لیتی ہیں۔ مولانا مودودی اپنی تصنیف ''سود'' میں تفصیل سے وضاحت کرتے ہیں کہ کس طرح قرآن کے معاشی اصولوں کو جدید معیشت پر لاگو کر کے سماجی بہبود کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ بڑھتی عدم مساوات اور معاشی تقسیم کے باعث موجودہ سرمایہ دارانہ نظام صرف اعلیٰ ذاتوں کو مستفید ہونے کا موقع دیتا ہے اور ادنیٰ ذاتوں کو محروم رکھتا ہے۔ ایسے میں سماجی بہبود اور معاشی انصاف کو فروغ دینے کے لیے اسلامی معاشی اصولوں سے بہت کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ

فینن، امبیڈکر اور مولانا مودودی کے نظریات بھارت میں سماجی انصاف کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے پُرعزم افراد کو بھرپور تحریک فراہم کرتے ہیں۔ ان کے متنوع نقطہ نظر سے حسب ضرورت اخذ کر کے ہم نسبتاً زیادہ منصفانہ اور عادلانہ معاشرے کے قیام کے لیے ایک زبردست خاکہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ یہ تقابلی تجزیہ نہ صرف ان مفکرین کی کسی قدر ہم آہنگی کو اجاگر کرتا ہے بلکہ استعماریت اور سماجی انصاف کے لیے تکثیری نقطہ نظر کی اہمیت کو بھی واضح کرتا ہے۔

ہندوتوا کے علم برداروں کی جانب سے ان مفکرین کے نظریات کی جان بوجھ کر کی گئی تحریف اور غلط تشریحات کا سامنا کرنا بہت ضروری ہے۔ فینن، امبیڈکر، اور مودودی کی کاوشوں کا سنجیدہ مطالعہ سماجی انصاف کو حقیقت کا روپ دینے کے عزم کا اظہار ہے جو فرقہ وارانہ اور ذات پات کی بنیاد پر تقسیم سے بالاتر ہے۔ ان تحریفات کی شناخت کرنا اور انھیں چیلنج کرنا ان کی علمی میراث کی حفاظت و ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔

تحریک اسلامی بھارت میں سماجی انصاف کے لیے سرگرم دیگر جماعتوں کے ساتھ ان مفکرین کے مشترکہ نظریات سے جامع بنیادوں پر استفادہ کر سکتی ہے۔ ان مفکرین کی پیش کردہ بصیرتوں کو باہم یکجا کر کے عدم مساوات اور ناانصافی کے کثیر جہتی چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مضبوط حکمت عملی تیار کی جا سکتی ہے، تاکہ مساوات، وقار اور اخلاقی سالمیت کا تحفظ ممکن ہو اور مثبت اقدار پر مبنی مستقبل کو یقینی بنایا جا سکے۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''زندگی نو'' نئی دہلی۔ ستمبر ۲۰۲۴ء)

لبنان میں پیجر دھماکے: مستقبل کی جنگ کی ایک جھلک

افتخار گیلانی

بھارتی فوج کے ایک سابق سربراہ جنرل سندر راجن پدمانا بھن، جن کا ابھی اگست میں ہی انتقال ہوا، نے ۲۰۰۴ء میں دہلی میں اپنے ایک ناول کا اجرا کیا۔ یہ ناول رائٹنگ آن دی وال پاکستان کے ساتھ ایک خیالی جنگ، جس میں امریکا پاکستان کی مدد کو آتا ہے، کے ارد گرد گھومتا ہے۔ فوجیوں اور ٹینکوں کے بجائے سائنسدانوں کے ذریعے مصنوعی ذہانت اور پوشیدہ ہتھیاروں کا استعمال کر کے مواصلاتی نظام میں خلل ڈال کر بھارت یہ جنگ جیت جاتا ہے۔

جب اجرا کے وقت ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس طرح کے ہتھیار وجود میں آچکے ہیں، تو بار بار انہوں نے وضاحت کی کہ یہ ایک مصنف کا تخیل ہے، اس کو فوج کی تیاریوں کے ساتھ نہ جوڑا جائے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار اسرائیلی سائنسدانوں کا ایک وفد دہلی میں تھا، اور ان کے سفارت خانہ نے چند صحافیوں کے ساتھ ان کی ایک نشست رکھی تھی۔ بات چیت کے دوران وفد میں شامل ان میں ایک سائنسدان نے کہا کہ جب بھی مارکیٹ میں کوئی سائنس فکشن آتا ہے، تو ان کا محکمہ اس کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ لیتا ہے اور معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کیا مصنف کے تخیل کو حقیقت میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ سائنسدانوں کو سائنس فکشن لکھنے والے مصنفین رچرڈ مورگن، السٹری نالڈس، (جن کے ناولوں کا مرکزی موضوع تھیوریٹکل فزکس ہوتی ہے) اور ان گنت دیگر مصنفین کی نگارشات کو پڑھنے کی نہ صرف ترغیب دی جاتی ہے، بلکہ یہ بھی رپورٹ کرنا پڑتا ہے کہ کیا اس کو عملی روپ دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے ان اسرائیلی سائنسدانوں کا کہنا تھا کہ وہ جاسوسی تھرلرز کو بھی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔

جنرل پدمانا بھن کا تخیل اور اسرائیلی سائنسدانوں کے یہ دعوے اس وقت واقعی حقیقت میں تبدیل ہوتے دیکھے گئے، جب ابھی حال ہی میں لبنان کے طول و عرض سے خبریں آنا شروع ہوئیں کہ حزب اللہ کے مواصلاتی آلات پیجر اور پھر بعد میں واکی ٹاکی میں پے در پے دھماکے ہو رہے ہیں، جن سے بچاس کے قریب افراد ہلاک اور تقریباً تین ہزار سے زائد افراد زخمی ہوئے ہیں۔

موبائل نیٹ ورک کو درکنار کرتے ہوئے حزب اللہ نے پیجر نیٹ ورک کو محفوظ اور قابل اعتماد مواصلاتی ذریعہ گردانا تھا، کیونکہ ان کو ہیک کرنے کا کم خطرہ رہتا ہے۔ مگر یہ خود ہی بم بن گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ حال ہی میں، حزب اللہ کو پیجرز کی ایک نئی کھیپ موصول ہوئی تھی۔ خبروں کے مطابق اسرائیلی ایجنٹوں نے سمندری جہاز کے ذریعے جانے والی پیجرز کی کھیپ تک رسائی حاصل کی تھی اور بیٹری کے ساتھ ہی اس میں چند گرام بارود رکھ کر ان کو دوبارہ بالکل اسی طرح پیک کر کے ان کو اپنے نیٹ ورک کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔

مگر ایک روز قبل حزب اللہ سے وابستہ کسی جنگجو کو دو پیجرز پر شک ہو گیا تھا کہ ان کی پیکنگ کھولی گئی ہے۔ اس سے قبل کہ تنظیم ان پیجرز پر مزید تحقیق کر کے ان کو کوڑے دان میں پھینک دیتی اسرائیلی وزیر اعظم بنیامن نیتن یاہو نے آپریشن کی منظوری دے دی۔ ان رپورٹوں کے مطابق اصل منصوبہ کی رو سے ان پیجرز کو اس وقت پھٹنا تھا، جب اسرائیل غزہ سے فراغت کے بعد باضابطہ لبنان پر حملہ کر دیتا۔ چونکہ یہ پیجر ہر جنگجو کے پاس موجود ہوتے، تو ایک ساتھ ان کے پھٹنے سے یکدم جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا۔

فی الحال حزب اللہ کا محفوظ مواصلاتی نظام، جو حملوں کو مربوط کرنے اور جنگجوؤں کو متحرک کرنے کے لیے ضروری تھا، اس کی کمزوری بن گیا ہے جس کا اسرائیل بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔ نہ صرف بیروت بلکہ ملک کے دیگر علاقوں میں بمباری کر رہا ہے۔ تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ حزب اللہ جو کبھی نظم و ضبط اور ناقابل تسخیر کے طور پر دیکھی جاتی تھی، اسے غیر محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میزائلوں اور جدید اسلحہ سے لیس انتہائی محفوظ فوج کو ڈیجیٹل دور میں انتہائی محفوظ خطرے میں ڈالا جاسکتا ہے۔

لبنان میں دھماکے ایک واضح یاد دہانی ہیں کہ جنگوں کی نوعیت بدل رہی ہے۔ اسرائیل کا یہ حملہ اس بات کی واضح مثال ہے کہ مستقبل کی جنگیں صرف بموں اور گولیوں سے نہیں بلکہ ڈیٹا، الگورتھم اور سائبر کارناموں سے لڑی جاسکتی ہیں۔

ماہرین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ حملہ ۲۱ویں صدی میں جنگ کے حوالے سے ایک اہم لمحہ ہے۔ سائبر حملے اکثر پوشیدہ ہوتے ہیں، جس میں کوئی نشان، کوئی ملبہ، اور گولہ بارود نہیں چھوڑا جاتا ہے۔

یہ حملے مواصلاتی نیٹ ورکس، پاور گرڈز، مالیاتی اداروں کو نشانہ بناتے ہیں۔ یہ اس بات کی بھی سنگین یاد دہانی کے طور پر کام کراتا ہے کہ ڈیجیٹل دور میں کس طرح انسان کے روز مرہ استعمال میں آنے والے آلات کو ہتھیار بنا کر بڑے پیمانے پر تباہی کے سامان کیے جاسکتے ہیں۔

اسرائیل کے نیشنل سائبر ڈائریکٹوریٹ کے سابق ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریفیل فرانکو کے مطابق حزب اللہ کو اس شاک سے نکلنے میں کافی وقت لگے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ اب ان کے جنگجو ہر پیجر اور موبائل فون کو شک کی نظر سے دیکھیں گے۔

اسرائیل نے فون اور دیگر آلات کو ہیک کرنے کی ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے خاصی سرمایہ کاری کی ہے۔ یعنی آپ کے گھر پر روبوٹک جھاڑو کو بھی ہیک کر کے اس کو آپ کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ فرانکو کا کہنا ہے کہ اسرائیلی خفیہ تنظیم موساد نے حزب اللہ کی سپلائی لائن کا پتا لگا لیا تھا۔

انہوں نے پتا لگایا تھا کہ چونکہ مغرب میں حزب اللہ کو دہشت گرد تنظیم کے زمرے میں رکھا گیا ہے، اس لیے یہ پیجرز کسی شیل کمپنی سے خریدے گئے ہوں گے۔ انہوں نے ہنگری میں بی اے سی کنسلٹنگ کا پتا لگایا تھا جس نے ان پیجرز کو سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا۔

فرانکو کا کہنا ہے کہ ایران جلد ہی حزب اللہ کو جدید مواصلاتی آلات بھیجے گا، مگر اس نئے نظام کو فعال ہونے میں مہینے نہیں تو ہفتوں لگیں گے۔ اس لیے ان کا کہنا ہے کہ اسرائیل کے پاس حزب اللہ کو گھٹنے ٹیکنے کے لیے مجبور کرنے کا بس یہی وقت بچا ہے۔ اس لیے پچھلے چند دنوں سے اسرائیل لبنان پر شدید بمباری کر رہا ہے۔ اس نئے سائبر وار سے قطع نظر ماضی میں بھی اسرائیلی ایجنٹوں نے کئی ایسے غیر روایتی حملے کر کے اپنے مخالفین کو ٹھکانے لگایا ہے۔

اسرائیل کی داخلی خفیہ ایجنسی شن بیت نے ۱۹۹۶ء میں غزہ میں حماس کے ایک رکن یحییٰ عیاش کو مارنے کے لیے خفیہ طور پر دھماکا خیز مواد سے لیس موبائل فون ان کے پاس پہنچایا۔ جب اسرائیلی ایجنٹوں نے تصدیق کی کہ فون ان تک پہنچ گیا ہے اور اس پر ان کی ہی آواز ہے، تو اس کو ریموٹ سے دھماکے سے اڑا دیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۹۷ء میں حماس کے پولیٹیکل بیورو کے سربراہ خالد مشعل کو قتل کرنے کے لیے

باقی صفحہ نمبر ۸

استعمار سے آزادی اور حصولِ انصاف کی یقین دہانی

ڈاکٹر شاداب منور موسیٰ

سماجی انصاف ایک بنیادی ضابطہ ہے، جو معاشرے میں تمام افراد کے ساتھ منصفانہ اور مساویانہ برتاؤ کو یقینی بناتا ہے۔ اس کا مقصد انسانوں کی ترقی وخوشحالی کے لیے درکار مواقع اور مراعات میں تفاوت کا خاتمہ ہے اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہے جس میں ہر شخص کو قطع نظر اس سے کہ وہ کس سماجی و معاشی پس منظر سے تعلق رکھتا ہے، وسائل تک رسائی کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ بھارت میں سماجی انصاف کو یقینی بنانا خاص طور پر ملک کے متنوع اور طبقاتی سماجی ڈھانچے کے پیش نظر بہت اہم ہے، جس کی جڑوں میں ذات پات اور مذہبی ومعاشی عدم مساوات سرایت کیے ہوئے ہے۔

سماجی انصاف کو شرمندہ تعبیر کرنے کے سلسلے میں استعمار سے آزادی (decolonization) کی تحریک اپنے آپ کو ایک اہم ماڈل کے طور پر پیش کرتی ہے۔ اس بابت بھارت کا پس منظر ایک لچک دار اور جدوجہد سے بھرپور ساخت مہیا کرتا ہے۔ بھارت میں متنوع نقطۂ ہائے نظر کو سمجھنا اور ان کا باہم ارتباط بصیرت میں جدت پیدا کرسکتا ہے اور مساوات وانصاف کی کوششوں کا احیا کرسکتا ہے۔ یہ مضمون اسی تناظر میں تین اہم مفکرین کے خیالات کا جائزہ لیتا ہے: فرانز فینن (Frantz Fanon)، بھیم راؤ امبیڈکر، اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جن کی کاوشیں سماجی عدم مساوات کے مقابلے کے لیے ایک قابل قدر فریم ورک مہیا کرتی ہیں۔ ان کے فلسفوں کے تقابل کے پیچھے ہمارا مقصد عملی بصیرت کا حصول ہے جو عصری تحریکوں کی انصاف پسند معاشرے کی طرف رہ نمائی کرسکے۔

ترکِ استعماریت اور ثقافتی تجدید: فینن کا وژن

فرانز فینن (Frantz Fanon)، مارٹی نیک سے تعلق رکھنے والا ایک نفسیاتی ماہر اور انقلابی تھا جو اپنی تصنیفات Black Skin, White Masks اور The Wretched of the Earth کے لیے مشہور ہے۔ نوآبادیات کے بارے میں فینن کے تجزیے اور اس کے نفسیاتی تاثرات نے نوآبادیاتی مخالف سوچ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ استعمار نوآبادکار اور نوآبادیاتی دونوں ہی کو انسانیت سے عاری بنادیتا ہے، جس کی وجہ سے مظلوموں میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ فینن نے پرتشدد بغاوت کو شناخت اور آزادی کی بحالی کے ایک ذریعہ کے طور پر باور کرایا اور نوآبادیاتی دور کے بعد ثقافتی تجدید کی ضرورت واہمیت پر زور دیا۔ ہندوستانی آزادی کی تحریک میں ٹیپو سلطان کی جدوجہد سے لے کر غدر تک، سبھاش چندر بوس سے لے کر بھگت سنگھ اور اسیران مالٹا تک جو نوآبادکار انگریزوں سے برسرپیکار ہوئے، فینن کی فکری مثالوں کے طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

نفسیاتی آزادی

نوآبادیات پر مرتب ہونے والے نفسیاتی اثرات کے بارے میں فینن کی تحقیق اس امر پر روشنی ڈالتی ہے کہ نوآبادیات کس طرح اپنے آپ پر ہو رہے جبر کے اثرات قبول کرنے لگتی ہیں۔ اپنی کتاب Black Skin, White Masks میں فینن نے کمتری کے اسی احساس کو بیان کیا ہے جسے نوآبادیاتی عوام اپنے اندر پروان چڑھاتے ہیں اور نوآبادکاروں کی تقلید کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر، فینن ایک گفتگو کا ذکر کرتا ہے جس میں ایک سیاہ فام آدمی کو اس کی ذہانت کا ثبوت دینے کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مغربی ادب کے کسی اقتباس کا حوالہ دے۔ یہ سیناریو اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ ہندوستانی اشرافیہ نے کیوں کر انگریزوں کی بارگاہ میں قبولیت حاصل کرنے کے لیے انگریزی رسم ورواج اور طرزِ تعلیم کو اپنالیا۔ اس نفسیاتی جنگ کا ادراک ترکِ استعمار کی جدوجہد کو گہرائی وگیرائی سے سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ فینن کی تحریری کاوشیں نوآبادیات کے ذہنی زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے ایک فریم ورک فراہم کرتی ہیں جو آزاد بھارت میں پسماندہ طبقات بشمول دلت، قبائلی، نیز حالیہ دنوں میں اسلاموفوبیا کے تناظر میں مسلمانوں کو لاحق ہوتے رہتے ہیں۔

بھارت پر برطانوی استعمار کی تاریخ فینن کی بیان کردہ متعدد حرکیات کا آئینہ دار ہے۔ انگریزی تعلیم، ثقافت اور اقدار کے نفاذ کی وجہ سے بھارتیوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو اپنے آپ کو اپنے نوآبادکاروں کی عینک سے دیکھنے لگا۔ اس کے سماجی درجہ بندی اور ثقافتی خودتخیلی پر دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ بھارت میں ذات پات کی درجہ بندی کی آڑ میں صدیوں تک یہی چلتا رہا۔ فینن کی ثقافتی تجدید کی اپیل نوآبادیاتی بھارت میں مقامی شناخت کے ازسرنو احیا کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ لیکن بھارت کے باشندوں کے لیے اس مقام پر سوال یہ کھڑا ہوتا ہے کہ آخر کون سا کلچر اختیار کیا جائے؟ یہاں ہندوتوا بیانیے اپنی تحریفات اور فریب کاریوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔

ہندوتوا کے حامیوں کی تحریف کاری

ہندوتوا کے حامیوں نے فینن کے افکار میں سے صرف وہی اخذ کیا ہے جو انھیں اپنے بیانیے کے موافق معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ہندو قوم پرست ایجنڈے کو درست ٹھیرانے کے لیے ان کی استعمار سے آزادی اور مزاحمت کے مطالبے کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ ہندوتوا کے حاملین خود کو بھارت کے ماقبل نوآبادیت کی عظمت کے حقیقی وارث کے طور پر پیش کرتے ہوئے فینن کے ثقافتی احیا کے مباحث کو یک رنگی ہندو ساخت کے فروغ کے لیے استعمال کرتے ہیں اور بھارتی سماج کے متنوع اور تکثیری تانے بانے کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

امبیڈکر کی ذات پات کے جبر سے لڑائی، طبقاتی نظام اور اس کے بعد ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر بھارتی تاریخ کی ایک بلند پایہ شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی زندگی ذات پات کے جبر سے مزاحمت اور دلتوں کے حقوق کی وکالت کی خاطر وقف کردی۔ بھارتی آئین کے معمار کے طور پر بھارت کے تئیں امبیڈکر کے وژن کی بنیاد آزادی، مساوات اور بھائی چارے کے اصولوں پر تھی۔ انھوں نے ذات پات کے نظام کو سماجی غلامی کی ایک شکل کے طور پر دیکھا جس کا خاتمہ حقیقی جمہوریت کے فروغ کے لیے لازمی تھا۔ ان کی تنقید گہرائی کی حامل بھی تھی اور بنیاد پرست بھی۔ انھوں نے طبقاتی نظام کو ایک ایسے سماجی ڈھانچے کے طور پر دیکھا جس نے عدم مساوات اور ناانصافی کو مضبوط کیا۔ ان کی معرکۃ الآراء تصنیف Annihilation of Caste ذات پات کے نظام کے مکمل خاتمے پر زور دیتی ہے۔ دلتوں کے لیے تعلیم، سیاسی نمائندگی اور قانونی حقوق کو فروغ دینے کے تئیں امبیڈکر کی جدوجہد کا مقصد ایک مساوی معاشرہ کی تشکیل تھا۔

پسماندہ طبقات کے لیے اہمیت

بھارتی مسلمانوں کے لیے جنھیں پسماندگی اور یک گونہ امتیازی سلوک کا بھی سامنا ہے، امبیڈکر کی حکمت عملی رہ نمائی کا کام دے سکتی ہے۔ ان کا تعلیم اور قانونی اصلاحات پر زور پسماندہ مسلم معاشرے کو بااختیار بنانے کی حالیہ کوششوں کے لیے نمونہ بن سکتا ہے۔ مثال کے طور پر پونا معاہدے میں

امبیڈکر کی طرف سے دلتوں کے لیے علیحدہ انتخابی حلقے کی تجویز پیش کی گئی جو حالیہ زمانے میں مسلمانوں کے لیے خصوصی سیاسی نمائندگی کی وکالت کے سلسلے میں ایک نمونہ کے طور پیش کی جاسکتی ہے۔ نیز سماجی انصاف کو یقینی بنانے میں ریاست کے کردار پر امبیڈکر کی کافی توجہ رہی جو انتظامی عدم مساوات کے خاتمہ کے لیے کوشاں متعدد اسلامی تحریکوں کے اہداف سے مماثلت رکھتی ہے۔ بھارت میں اسلاموفوبیا سے نمٹنے کے لیے قانون سازی میں اصلاحات کے لیے زور دینا آج وقت کی ضرورت ہے۔

ہندوتوا کے علم برداروں کا تسلط

مختلف سیاسی گروپ امبیڈکر کے نظریات کی از سرنو تشریح کرکے انھیں توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں، ان میں ہندوتوا بھی شامل ہے جو ایک دائیں بازو کا نظریہ ہے اور ایک ہندو قوم کی بالادستی کے قیام کی کوشش کر رہا ہے۔ ہندوتوا کے نظریہ سازوں نے امبیڈکر کی اسلام پر تنقید کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہندوتوا کے ایک حلیف کے طور پر نظر آئیں، جب کہ ذات پات اور برہمنیت پر ان کی تنقید کو یہ لوگ پردۂ خفا میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوتوا کے حامی اکثر امبیڈکر کی تصنیف Pakistan or the Partition of India میں سے مسلمانوں کے بارے میں امبیڈکر کی تنقید کو اچھالتے ہیں، جب کہ اس میں انھوں نے پاکستان کی تشکیل کے مخصوص تاریخی اور سماجی پس منظر پر بحث کی ہے۔ اس طرح کی تشریح کی مدد سے امبیڈکر کو مسلم مخالف جذبات بھڑکانے والوں کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور دوسری طرف سماجی انصاف کے لیے ان کی وسیع کاوش اور ہندو کٹر پنتھی اور ذات پات کے نظام پر ان کی شدید تنقید کو چھپایا جاتا ہے۔

اس طرح کی غلط تشریح امبیڈکر کے ورثے کو مسخ کر دیتی ہے، جو بنیادی طور پر ذات پات مخالف اور سیکولر ہے۔ امبیڈکر کا بدھ مت کو قبول کرنا اصل میں ہندومت کے ذات پات کے نظام کو مسترد کرنے کے لیے تھا، جسے وہ فطری طور پر ظالمانہ نظام تصور کرتے تھے۔ ہندوتوا کے اسکالر صرف مسلمانوں پر ان کی تنقید پر توجہ مرکوز کرکے ذات پات کے تئیں ان کی مذمت اور ایک جامع مساویانہ معاشرے کے قیام کے ان کے وژن کو پسِ پشت ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حصولِ انصاف کے لیے مولانا مودودی کا اسلامی وژن

سید ابوالاعلیٰ مودودی بیسویں صدی کے ایک ممتاز اسلامی مفکر تھے، انھوں نے اسلامی اصولوں پر مبنی سماجی انصاف کا وژن پیش کیا۔ مولانا مودودی نے واضح کیا کہ اسلام سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف کے لیے ایک جامع فریم ورک مہیا کرتا ہے۔ انھوں نے حکومت الٰہیہ کے تصور پر زور دیا، جہاں خدا کا قانون (شریعت) ایک انصاف پسند معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے۔

مولانا مودودی اپنی تحریروں میں سماجی انصاف کے حصول کے لیے اسلامی ریاست کے قیام پر زور دیتے ہیں۔ ان کے مطابق سیکولر نظامِ انصاف کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے جنم لینے والے مسائل کا حل پیش کرنے میں ناکام ہے۔ مولانا مودودی کا اسلامی ریاست کا تصور وہ ہے جہاں حکومت قرآن وسنت کے اصولوں پر مبنی ہو، انصاف، مساوات اور انسانی وقار کو یقینی بنایا جائے۔ مولانا مودودی اپنی تصنیفات ''چار بنیادی قرآنی اصطلاحات''، ''خلافت و ملوکیت'' اور ''اسلامی طرز زندگی'' میں اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت کس طرح سماجی پیچیدگیوں کو ہموار کرسکتی ہے۔ وہ ان آمرانہ رجحانات کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو ملوکیت نظام کے تحت مسلمانوں کی طرف سے اسلامی اصولوں کے مسخ شدہ استعمال سے جنم لیتے ہیں۔

حصولِ انصاف کے لیے منفرد نقطہ نظر

مولانا مودودی کا پیش کردہ سماجی انصاف کا ماڈل اپنے انداز میں منفرد ہے۔ برخلاف سیکولر فریم ورک کے جو مذہب کو سیاست وحکومت سے الگ تھلگ کر دیتا ہے، مولانا مودودی اخلاقی وروحانی اقدار کو سیاسی واقتصادی شعبوں میں داخل کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسانی زندگی کی اخلاقی وروحانی جہتوں کو مخاطب کیے بغیر حقیقی انصاف کا حصول ممکن نہیں ہے۔ مثلاً ''انسان کے معاشی مسائل اور ان کے اسلامی حل'' میں زکوۃ پر بحث کرتے ہوئے مولانا مودودی وضاحت کرتے ہیں کہ کس طرح دولت کی از سرنو تقسیم سماجی انصاف کا ایک ذریعہ بن سکتی ہے۔ یہ نقطہ نظر عوامی زندگی کے سیکولرائزیشن کو چیلنج کرتا ہے اور سماجی انصاف کے لیے ایک جامع فریم ورک پیش کرتا ہے جس میں اخلاقی وروحانی جہتوں کی ترقی شامل ہے۔

بھارت کے متنوع اور تکثیری معاشرے کے تناظر میں، مولانا مودودی کے نظریات مغربی سیکولرازم اور اسلام کی روایت پسند بعض تشریحات کو چیلنج کرتے ہیں۔ مولانا مودودی کا پیش کردہ انصاف کا وژن بھارت میں اخلاقی سالمیت، تمام شہریوں کی فلاح و بہبود، سماجی و اقتصادی تفاوت کے خاتمے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کی کوششوں کو تحریک دیتا ہے۔ مولانا مودودی کے یہاں ایک اخلاقی اور انصاف پسند معاشرے کے قیام کے مطالبہ کی گونج سماجی انصاف کی تحریکوں کے وسیع اہداف کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔

ہندوتوا کے علم برداروں کی تحریف اور موقف کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش

مولانا مودودی نے حکومت الٰہیہ کے قیام کی جس طرح شدومد سے وکالت کی ہے ان کے اس موقف کو دنیا بھر میں ہندوتوا کے حامیوں اور اسلاموفوبیا کے علم برداروں نے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہوئے اسے بھارت کے اجتماعی تانے بانے کے لیے خطرہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے مولانا مودودی کے نظریات کو فطری طور پر ہندو قوم پرستی کے مخالف کے طور پر پیش کیا ہے، ان کے نظریات کو فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دینے اور بالعموم مسلمانوں اور بالخصوص اسلامی تحریکوں کے خلاف امتیازی پالیسیوں کو جواز فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

ہندوتوا کے علم بردار اکثر مولانا مودودی کے اسلامی ریاست کے قیام کے مطالبے کو بھارت کی جمہوریت کے لیے خطرے کے طور پر اجاگر کرتے ہیں۔ سیاق وسباق سے کاٹ کر کی گئی یہ غلط تشریح مولانا مودودی کے انصاف، مساوات اور اخلاقی سالمیت کے وسیع تر مطالبے کو نظر انداز کرتی ہے اور اس کے بجائے ان کے نظریات کو مسلم قوم کی پسماندگی کا سبب بتلاتی ہے۔

ہندوتوا کے حامی مولانا مودودی کے موقف کو توڑ مروڑ کر پیش کرکے فرقہ وارانہ خلیج کو مزید گہرا کرتے ہیں اور سماجی ہم آہنگی کی کوششوں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ یہ غلط تشریح مسلمانوں کے خلاف دقیانوسی تصورات وتعصّبات کو تقویت پہنچانے کا کام کرتی ہے، بین المذاہب مکالمے وتعاون کے مواقع کو نقصان پہنچاتی ہے۔ سماجی انصاف کی تحریکوں کے لیے ان تحریفوں کو چیلنج کرنا اور ایک منصفانہ اور اخلاقی معاشرے کے قیام کے تئیں مولانا مودودی کے وژن کو از سرنو پیش کرنا بہت ضروری ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۰

سری لنکا کے نومنتخب صدر اور بھارت کے لیے اس کے معنی

اقتصادی بحران کا سامنا کرنے والے سری لنکا کے لوگوں نے بے حد معمولی دیہی پس منظر سے تعلق رکھنے والے بائیں بازو کے رہنما انورا کمارا ڈسانائیکے کو اپنا نیا صدر منتخب کر لیا ہے۔ ۵۵ سالہ ڈسانائیکے جنتھا وِمکتی پیرامونا (جے وی پی) کے لیڈر ہیں، جو مارکسسٹ۔لینینسٹ نظریات کی طرف جھکاؤ رکھنے والی پارٹی ہے۔ وہ صدارتی انتخابات میں نیشنل پیپلز پاور (این پی پی) اتحاد کے امیدوار تھے۔

ڈسانائیکے نے ۴۲ء۳۱ فیصد ووٹ حاصل کیے اور ان کے سب سے قریبی حریف سجت پریماداسا (سابق صدر رانا سنگھے پریماداسا کے بیٹے) کو ۳۲ء۷۶ فیصد ووٹ ملے، وہیں موجودہ صدر رنیل وکرما سنگھے صرف ۱۷ء۲۷ فیصد ووٹوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر رہے۔ سابق صدر مہندا راجا پکشے کے بیٹے نمل راجا پکشے کو تین فیصد سے بھی کم ووٹ ملے۔

یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ سری لنکا کے بڑے سیاسی گھرانوں کو شکست دے کر انورا کمارا ڈسانائیکے عوام کی پہلی پسند بنے ہیں۔ ڈسانائیکے محنت کش طبقے کی وکالت اور سیاسی اشرافیہ کے خلاف اپنی جارحانہ تنقید کے لیے معروف ہیں۔

قابل ذکر ہے کہ سال ۲۰۲۲ء میں بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہروں کے بعد گوٹابایا راجہ پکشے کو صدارتی عہدہ چھوڑنا پڑا تھا، اس کے بعد سے ملک میں عوام کی منتخب کردہ کوئی حکومت نہیں تھی۔

انورا کمارا ڈسانائیکے کون ہیں؟

انورا کمارا ڈسانائیکے ۲۴ نومبر ۱۹۶۸ء کو وسطی صوبے کے ایک چھوٹے سے گاؤں گالیویلیمیں پیدا ہوئے۔ تاہم، ان کی پرورش کیکی راوا میں ہوئی۔

انڈین ایکسپریس کے مطابق، ان کی تعلیم کا آغاز دمبوتھ گاما کے گامنی اسکول سے ہوا اور بعد میں انہوں نے دمبوتھ گاما سینٹرل کالج میں داخلہ لیا۔ وہ پڑھائی میں اول تھے۔ وہ اپنے اسکول سے یونیورسٹی میں داخلہ پانے والے پہلے طالب علم تھے۔

سال ۱۹۹۲ء میں ڈسانائیکے نے کولمبو کے قریب یونیورسٹی آف کیلانیہ میں زرعی علوم کا مطالعہ شروع کیا۔ گریجویشن کے دوران ہی وہ جنتھا وِمکتی پیرامونا (جے وی پی) کی طرف متوجہ ہوئے، جس کی شناخت ۱۹۷۱ء اور ۸۹۔۱۹۸۷ء کی مسلح بغاوتوں سے تھی۔ اس وقت یہ پارٹی مظلوم سنہلی دیہی نوجوانوں کی نمائندگی کے لیے معروف تھی۔

جنتھا وِمکتی پیرامونا کا مقصد اس سیاسی اور معاشی نظام کو اکھاڑ پھینکنا تھا، جسے وہ استحصالی اور جاگیردارانہ سمجھتے تھے۔

ڈسانائیکے نے ۱۹۹۵ء میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی اور انھیں ۱۹۹۷ء میں جے وی پی کے یوتھ ونگ سوشلسٹ یوتھ آرگنائزیشن کا نیشنل کوآرڈینیٹر بنایا گیا۔ ڈسانائیکے نے جلد ہی پارٹی کے اندر ایک تبدیلی لانے والی شخصیت کے طور پر اپنی شناخت بنالی۔ ایک سال بعد ۱۹۹۸ء میں انہیں جے وی پی کی مرکزی کمیٹی اور پھر اس کی سیاسی کمیٹی میں شامل کیا گیا۔ انتخابی سیاست میں ان کا پہلا امتحان ۱۹۹۸ء کے مرکزی صوبائی کونسل کے انتخابات میں آیا۔ تاہم، جے وی پی اس میں جیت حاصل نہیں کر سکی۔

دو سال بعد ڈسانائیکے پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوئے۔ ۲۰۰۴ء میں بنی مخلوط حکومت میں انہوں نے زراعت اور آبپاشی کے وزیر کے طور پر کام کیا۔ وزیر کے طور پر انہوں نے ایک اہل منتظم کی حیثیت سے عزت حاصل کی۔ اپنے دور میں انہوں نے زرعی اصلاحات اور دیہی ترقی کو سیاسی بحث کے مرکز میں رکھا۔

ڈسانائیکے ۲۰۱۴ء سے جے وی پی کی قیادت کر رہے ہیں۔ اپنی قیادت میں ڈسانائیکے نے نہ صرف پارٹی کو مسلح جدوجہد سے پارلیمانی سیاست تک پہنچایا بلکہ پارٹی کی پرتشدد شبیہ کو مٹانے کا کام بھی کیا۔ ڈسانائیکے کی قیادت میں جے وی پی نے اپنے سرمایہ دار مخالف موقف کو نرم تو کیا لیکن اپنے سامراج مخالف بیان بازی کو برقرار رکھا۔

انڈین ایکسپریس کے مطابق ایک رہنما کے طور پر انورا کمارا ڈسانائیکے نے طبقاتی جدوجہد جیسے کلاسیکی مارکسی نظریات کے مقابل کرپشن مخالف اقدامات، گورننس اصلاحات اور قوم پرستی پر توجہ مرکوز کی ہے۔

ڈسانائیکے کو جیت کیسے ملی جیت؟

سال ۲۰۱۹ء میں ڈسانائیکے سری لنکا کی سیاست میں ایک نمایاں شخصیت کے طور پر ابھرے، اور انہیں نو تشکیل شدہ نیشنل پیپلز پاور (این پی پی) اتحاد کا صدارتی امیدوار بنایا گیا۔ اگرچہ انہیں صرف ۳ء۱۶ فیصد ووٹ ملے لیکن یہ ۲۰۱۹ء کی مہم تھی جس نے ۲۰۲۴ء کے انتخابات کی بنیاد رکھی۔

اس پس منظر میں ڈسانائیکے کے حق میں ماحول بنایا گیا اس کی وضاحت کرتے ہوئے سینئر صحافی نروپما سبرامنیم دی وائر کو بتاتی ہیں، 'گوٹابایا راجاپکشے کی حکومت میں سری لنکا کے لوگوں کو صاف نظر آرہا تھا کہ وہ کس قدر غربت میں زندگی گزار رہے ہیں، کھانے پینے کی چیزوں اور بنیادی سہولتوں کو ترس رہے ہیں اور حکومت کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے۔ دوسری طرف حکومت چلانے والوں کی دولت بڑھتی جا رہی تھی اور ان کے خاندان کے افراد بیرون ملک عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ لوگ حکومت کی اس کرپشن اور اقربا پروری سے تنگ آ چکے تھے۔'

انہوں نے مزید کہا، ۲۰۲۲ء میں اس کے خلاف بڑے پیمانے پر مظاہرے ہوئے اور گوٹابایا راجا پکشے کو اپنا عہدہ چھوڑنا پڑا۔ جے وی پی ۲۰۲۲ء کے 'آراگلیا' (اس لفظ کا مطلب سنہلی زبان میں جدوجہد ہوتا ہے) میں بھی شامل تھا، لیکن ایک لیڈر کے طور پر نہیں۔ اس کے بعد رنیل وکرما سنگھے صدر بنے۔ جبکہ ان کے پاس پارلیمنٹ میں ایک بھی سیٹ نہیں تھی۔ دراصل، عام طور پر صدارتی انتخاب ووٹرز کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ لیکن خاص حالات میں پارلیمنٹ یہ کام بھی کر سکتی ہے۔ گوٹابایا کے عہدہ چھوڑنے کے بعد ان کی پارٹی نے رنیل وکرما سنگھے کی حمایت کر دی۔ اب تحریک اور جدوجہد میں شامل لوگ اپنے آپ کو ٹھگا ہوا محسوس کر رہے تھے کیونکہ وہ پورے سیاسی نظام میں تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہوئے سڑکوں پر اترے تھے۔'

سبرامنیم نے مزید کہا، ۲۰۲۲ء کے بعد بھی لوگوں کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ مہنگائی بڑھتی رہی۔ بجلی کے بلوں کی عدم ادائیگی پر لوگوں کے کنکشن کاٹ دیے گئے۔ لوگ ایندھن اور ادویات کی فکر میں مبتلا رہے۔ لیکن اس بار لوگوں نے اپنے غصے کا اظہار احتجاج کی صورت میں نہیں کیا اور اس دوران ڈسانائیکے نے خود کو تبدیلی کے چہرے کے طور پر پیش کیا۔ لوگوں نے 'آراگلیا' کے دوران قومی سطح پر ڈسانائیکے کو دیکھا تھا، اس لیے وہاں جو بھی حکومت مخالف ووٹ تھا، جو تبدیلی چاہتے تھے، بائیں بازو کے رہنما کی طرف شفٹ ہو گیا۔ ویسے بھی، جے وی پی سری لنکا میں واحد کیڈر بیس پارٹی ہے۔'

انڈین ایکسپریس کی ایک خبر بھی اس جانب اشارہ کرتی ہے، 'اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے کہ بائیں بازو کی جے وی پی سری لنکا کی تاریخ میں پہلی بار فاتح بن کر ابھری، کیونکہ اس کے آثار گزشتہ ڈھائی سال سے نظر آرہے تھے۔'

بھارت کے لیے اس جیت کے کیا معنی ہیں؟

جے وی پی کی تشکیل ۱۹۶۰ء کی دہائی میں کمیونسٹ پارٹی آف سری لنکا (سی پی ایس ایل) سے الگ ہونے والے ایک گروپ نے کی تھی، جسے چین نواز سمجھا جاتا تھا۔ درحقیقت، اس وقت عالمی کمیونسٹ تحریک دو بڑے دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک سوویت یونین سے منسلک تھی، جو اپنی فطرت میں زیادہ اصلاح پسند اور پارلیمانی سوشلسٹ تھی اور دوسری چین کے ساتھ، جو انقلابی جدوجہد اور ماؤسٹ اصولوں کی وکالت کرتی تھی۔

جے وی پی نے سری لنکا میں ہندوستان کے اثرات کو کم کرنے کے لیے پرتشدد تحریک بھی شروع کی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں تامل علیحدگی پسندوں (خاص طور پر ایل ٹی ٹی ای سے وابستہ جنگجوؤں) کو کچلنے میں سری لنکا حکومت کی مدد کرنے کے لیے راجیو گاندھی کی حکومت نے انڈین پیس کیپنگ فورس (آئی پی کے ایف) بھیجی تھی، جس کی جے وی پی نے سخت مخالفت کی تھی۔

انڈین ایکسپریس کے مطابق، اس عرصے میں جے وی پی نے بھارتی اشیا اور کاروبار کو نشانہ بنایا تھا۔ اس مہم کے دوران ۱۹۸۹ میں ایک دواساز کمپنی کے سربراہ کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔

جے وی پی کا سنہلی قوم پرست طرزِ عمل سری لنکا کی اقلیتی برادریوں جیسے تمل اور مسلمانوں کے خلاف بھی رہا ہے۔ تاہم، ماہرین کا خیال ہے کہ یہ پرانی باتیں ہیں۔ اب جے وی پی کا راستہ بدل گیا ہے۔

سبرا منیم بھی کہتی ہیں کہ جے وی پی میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ سنہلی قوم پرستی کے نظریات اور بائیں بازو کی پرانی اقتصادی پالیسی پر اختلافات کی وجہ سے پارٹی تقسیم بھی ہو چکی ہے۔ جب سے ڈسانائیکے نے پارٹی کی کمان سنبھالی ہے، وہ پرانے داغوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جہاں تک بھارت کے ساتھ تعلقات کا تعلق ہے تو اس نے بھارت کو ایک اقتصادی طاقت کے طور پر قبول کیا ہے، ان کا ماننا ہے کہ بھارت کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ ویسے بھی سری لنکا کا زیادہ تر انحصار بھارت سے درآمد ہونے والی اشیا پر ہے، چاہے وہ آلو، دال اور ٹماٹر ہی کیوں نہ ہو۔

سری لنکا میں بحران کے دوران بھارت نے مالی مدد کی تھی، چین بھی سری لنکا کی مدد کرتا رہا ہے۔ ایسے میں سری لنکا کی نئی حکومت اس بات کو سمجھے گی کہ کسی بھی پڑوسی ملک کے ساتھ خراب رشتہ اس کی معیشت کے لیے کتنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

سبرا منیم کا ماننا ہے کہ ایک دوسرے کے تئیں دونوں ملکوں کی خارجہ پالیسیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ جب سری لنکا میں ڈسانائیکے کی ہوا کی آہٹ ملی تو دہلی نے بھی انہیں فوراً مدعو کیا۔ وہ اس سال فروری میں بھارت آئے تھے۔ ان کی وزیر خارجہ ایس جے شنکر اور قومی سلامتی کے مشیر اجیت ڈوبھال اور دیگر سینئر حکام سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے دہلی اور کیرالہ سمیت کئی مقامات کا دورہ کیا تھا۔

اگرچہ انڈین ایکسپریس نے لکھا ہے کہ ڈسانائیکے کچھ محاذوں پر بھارت کے مفادات کو چیلنج کر سکتے ہیں، ڈسانائیکے نے سری لنکا کے آئین کی ۱۳ویں ترمیم کے نفاذ کی حمایت نہیں کی ہے، جو ملک کی تامل اقلیت کو اختیارات دیتا ہے اور یہ طویل عرصے سے بھارت کا مطالبہ رہا ہے۔ انہوں نے لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلم (ایل ٹی ٹی ای) اور سری لنکن آرمی کے درمیان خانہ جنگی کے دوران ہونے والے مبینہ جنگی جرائم کی تحقیقات کی بھی مخالفت کی ہے۔ حالیہ مہینوں میں انہوں نے سری لنکا میں الیکشن میں کامیابی کے بعد اڈانی کے ۴۵۰ میگاواٹ کے ونڈ پاور پروجیکٹ کو منسوخ کرنے کی بھی بات کہی ہے۔ انہوں نے اس معاہدے کو کرپٹ اور ملکی مفادات کے خلاف قرار دیا ہے۔'

سبرا منیم کا کہنا ہے کہ اڈانی کے خلاف ناراضی صرف جے وی پی یا ڈسانائیکے میں نہیں ہے۔ جس طرح سے یہ معاہدہ ہوا تھا، اس کے خلاف ایک طرح سے پورے سری لنکا میں ناراضگی ہے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۶ ستمبر ۲۰۲۴ء)

یوکرین اور غزہ: مغربی ممالک کے تضادات

ملیحہ لودھی

گزشتہ ہفتہ امریکی صدر جو بائیڈن نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے اپنی الوداعی تقریر کی جہاں انہوں نے فخریہ انداز میں بتایا کہ انہوں نے روسی جارحیت کے خلاف یوکرین اور اس کے عوام کا کیسے دفاع کیا۔ لیکن جب بات مشرق وسطیٰ کی آتی ہے تو ان کی پالیسیوں میں تضاد نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

جارحیت اور جبر کا سامنا کرتے فلسطینی عوام کے لیے جو بائیڈن نے کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کے بجائے اسرائیل کو مظلوم کے طور پر دکھایا۔ انہوں نے عالمی ممالک پر زور دیا کہ وہ جنگ جیتنے کے لیے یوکرین کی مدد کریں اور کہا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق دیرپا امن کے قیام تک، امریکا کبھی بھی اس معاملے پر 'آنکھ بند' نہیں کرے گا۔

مشرق وسطیٰ کی بات آئی تو جو بائیڈن نے ۷ اکتوبر کی ہولناکیوں اور حماس کی جانب سے یرغمال بنائے گئے افراد پر اپنی توجہ مرکوز رکھی جبکہ اسرائیل کی ایک سال سے جاری غزہ جنگ سے ہونے والی شہادتوں اور تباہی پر انہوں نے بہت کم بات کی۔ اسرائیل نے اقوام متحدہ کے چارٹر کی بار بار خلاف ورزی کی لیکن اس کے باوجود جو بائیڈن نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

جو بائیڈن نے غزہ میں جنگ بندی کی ضرورت پر بات کی اور خطے میں بڑی جنگ سے اجتناب برتنے سے متعلق بیان دیا۔ لیکن ان کا یہ بیان محض لفاظی لگا کیونکہ ان کی انتظامیہ گزشتہ مہینوں سے مشرق وسطیٰ تنازع میں جو کردار ادا کر رہی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کی جانے والی قراردادوں کو امریکا نے جس طرح ویٹو کیا اور اسرائیل کو بلاتعطل ہتھیاروں کی فراہمی سے امریکا کا اس جنگ میں کردار ثابت ہو چکا ہے۔ گزشتہ ایک سال میں واشنگٹن نے اسرائیل کو ۱۲ ارب ڈالرز سے زائد کے ہتھیاروں کی فراہمی کی اور اپنی افواج کو بھی خطے میں تعینات کیا تاکہ وہ 'اسرائیل کی حفاظت' کر سکے۔ گزشتہ ہفتے اسرائیل نے امریکا کی جانب سے ۸ء۷ ارب ڈالرز کی اضافی امداد وصول کی۔

گزشتہ گیارہ ماہ میں بائیڈن انتظامیہ نے اسرائیلی بمباری اور فوجی جارحیت سے شہید ہونے والے ہزاروں مظلوم بے گناہ فلسطینیوں (شہدا کی تعداد ۴۱ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے) کے بارے میں انتہائی شاذونادر ہی اپنے لب کھولے۔ انہوں نے کبھی بھی اسپتالوں اور طبی عملے پر اسرائیل کے حملوں کی مذمت نہیں کی، جبکہ امریکی سرکاری ترجمان اکثر ان حملوں کے بارے میں میڈیا کے سوالات پر بھڑک اٹھتے ہیں جو بلاشبہ بین الاقوامی انسانی قوانین کی سنگین خلاف ورزی ہیں۔

امریکا کے اس موقف نے اسرائیل کو اپنے مظالم جاری رکھنے کا لائسنس دے دیا ہے۔ اسے حوصلہ ملا ہے کہ وہ غزہ میں نسل کشی جاری رکھے جبکہ وہ سلامتی کونسل کی انسانی بنیادوں پر جنگ میں وقفے، غزہ میں امداد کے داخلے کی اجازت جیسے مطالبات کو بھی نظرانداز کر رہا ہے۔ اس نے عالمی عدالت

برائے انصاف کے احکامات کو بھی نظرانداز کیا۔

اسرائیل نہ صرف نسل کشی جاری رکھے ہوئے ہے بلکہ وہ مغربی کنارے پر اپنی کارروائیوں کا دائرہ کار بھی بڑھا چکا ہے۔ اس نے حماس اور حزب اللہ کے کمانڈروں کو شہید کیا بلکہ لبنان میں اپنی کارروائیاں مزید تیز کردی ہیں۔

اسرائیل نے لبنان میں جب پیجرز حملے کیے تب واشنگٹن اور دیگر مغربی ممالک کی جانب سے چپ سادھ لی گئی۔ اگر اسرائیل کے بجائے کوئی اور ملک ایسی کوئی کارروائی کرتا تو مغرب یقیناً اسے دہشت گردی قرار دیتا۔ یہ واضح طور پر دہشت گردی ہی تھی۔ اسرائیل نے مغربی کنارے میں اپنے وحشیانہ حملوں کا سلسلہ تیز کیا جس کے نتیجے میں شہریوں کی ہلاکت ہوئی اور انفرااسٹرکچر کو انتہائی سنگین نقصان پہنچا۔

اسرائیلی وزیراعظم بنیامن نیتن یاہو نے جو بائیڈن انتظامیہ کی کمزور پوزیشن اور امریکی سیاسی توجہ انتخابات پر ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آزادانہ کارروائیاں کیں جبکہ علاقائی جنگ کے خطرے کے حوالے سے واشنگٹن کی تنبیہ کو نظرانداز کیا۔

بنیامن نیتن یاہو کو یہ بھی اندازہ ہوچکا ہے کہ امریکا اسرائیل کو روکنے کے لیے اپنے اختیارات (جیسے ہتھیاروں کی فراہمی معطل کرنا) کا استعمال نہیں کرے گا، بالخصوص تب جبکہ وہ اسرائیل کے 'دفاع کے حق' کو جواز بنا کر اس کی حمایت کا اعادہ کرتا ہے۔ جنگ بندی اور یرغمالیوں کی واپسی کے معاہدے کے لیے امریکا نے بہت تاخیر سے کوشش کی لیکن اس نے اسرائیل پر دباؤ نہیں ڈالا جس نے اسرائیلی حکومت کو اتنا وقت دے دیا کہ وہ امن کی کوششوں کی آڑ میں اپنی وحشیانہ کارروائیوں کا سلسلہ جاری رکھے۔

نیتن یاہو نے جنگ بندی یا امن معاہدے پر کسی طرح کی دلچسپی ظاہر نہیں کی کیونکہ ان کی سیاسی بقا کا دارومدار ہی جنگ جاری رکھنے پر ہے۔ انہیں کرپشن الزامات کا سامنا ہے۔ بنیامن نیتن یاہو نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے اپنے خطاب میں جنگ بندی کے عالمی مطالبات کو مسترد کردیا۔

تاہم بائیڈن انتظامیہ میں موجود چند حلقے اسرائیل کے اس غلط گمان سے اتفاق کرنے لگے ہیں کہ تشدد اور جبر کے زیادہ استعمال سے امن ممکن ہے۔ اسرائیل نے اپنے دعوے کو تنازع کا 'نیا مرحلہ' قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر تل ابیب نے لبنان پر متعدد فضائی حملے کیے جنہیں حالیہ دہائیوں کی سب سے بڑی کارروائی بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان حملوں میں ۷۰۰ افراد شہید ہوئے۔ ان حملوں کے بعد سے بڑی جنگ کے خطرات بڑھ چکے ہیں جو کہ پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔

حسن نصراللہ کی شہادت کے بعد حزب اللہ کے اتحادی ایران کا موقف انتہائی اہم ہوگا۔ اب تک ایران نے تحمل سے کام لیا ہے۔ ایرانی صدر مسعود پزشکیان نے اسرائیل کے بھڑکانے کے باوجود جنگ کا حصہ بننے سے گریز کیا ہے۔ اپنی سرزمین پر حماس کے سربراہ اسمٰعیل ہنیہ کے قتل کے بعد بھی انہوں نے جوابی کارروائی کا حکم نہیں دیا۔

نیویارک میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرتے ہوئے مسعود پزشکیان نے کہا کہ اسرائیل ان کے ملک کو اس جنگ میں گھسیٹنے کی کوشش کررہا ہے کہ جس میں شامل ہونے کی اس کی کوئی خواہش نہیں۔ تاہم اسرائیل جس نے لبنان پر زمینی حملے کے لیے اپنی افواج کو تیار کیا ہے، ایک اور ریڈ لائن عبور کرنے پر ایران کارروائی کرنے پر مجبور ہوسکتا ہے۔

گلوبل ساؤتھ کے ممالک جو مغربی ممالک کی حکومتوں کی طرح منافقت اور دہرے معیار نہیں رکھتے، ان کی جانب سے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں فلسطینیوں کی حمایت اور اسرائیل کی مذمت کی گئی۔ اسپین، ناروے اور آئرلینڈ جیسے مغربی ممالک کے علاوہ دیکھا جائے تو بیشتر مغربی ممالک نے اسرائیل کی اندھی حمایت میں بین الاقوامی قوانین اور انسانی حقوق کے بنیادی اصولوں کو نظرانداز کیا۔

وہ یوکرین میں روسی افواج کی جارحیت اور شہریوں کو نشانہ بنانے کی مذمت کرتے ہیں لیکن غزہ کے معاملے میں ان کے نظریات تبدیل ہوجاتے ہیں۔ وہ خود سے کبھی یہ سوال نہیں پوچھتے کہ بے گناہ شہریوں کو نشانہ بنانے، بچوں کو مارنے، ہسپتالوں پر بمباری، لوگوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کرنے اور غزہ کی آبادی کو خوراک سے محروم رکھنے کا آخر کیا جواز ہوسکتا ہے؟

اس کے بجائے وہ بار بار اسرائیل کو دفاع کا حق حاصل ہے کا منتر پڑھتے ہیں کہ گویا جیسے یہ اسرائیل کو ہر بین الاقوامی قانون کو توڑنے، جنگی جرائم کا ارتکاب، ممالک کی خودمختاری پر حملہ اور پوری قوم کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی اجازت دیتا ہے۔ اس روش سے اسرائیل محفوظ نہیں ہوگا بلکہ اس کے دشمنوں میں اضافہ ہوگا اور وقت کے ساتھ ساتھ قابض قوتوں کے خلاف مزاحمت مضبوط ہوگی۔

عرب حکومتیں اسرائیل کو غزہ میں نسل کشی سے روکنے میں ناکام رہی ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے صرف مذمتی بیانات جاری کیے۔ عرب ممالک کی جانب سے کسی قسم کی کارروائی نہ کیے جانے کی صورت میں اسرائیل کو اپنی کارروائیاں جاری رکھنے کا حوصلہ ملا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ اس وقت انتہائی نازک موڑ پر کھڑا ہے۔ اسرائیلی کارروائیوں نے خطے کو ایک وسیع جنگ کے دہانے پر لاکھڑا کیا ہے۔ فلسطین کے نڈر لوگوں کی اذیت ناک تاریخ کا یہ تاریک ترین باب ہے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ سخت حالات کا سامنا کرنے کے باوجود قابض قوت کے خلاف مزاحمت کا سلسلہ کبھی تھما نہیں۔

"A dangerous moment".
(Daily "Dawn" Karachi. September 30, 2024)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتاب

اُمتِ مسلمہ

منصب، تقاضے اور مستقبل

علامہ یوسف القرضاوی

قیمت: ۱۵۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950